دہشت کے بعد

تالیف: اکبر احمد / برائن فورسٹ

ترجمہ: ایم وسیم



دہشت کے بعد

تالیف: اکبر احمد / برائن فورسٹ
ترجمہ: ایم وسیم

پرنٹ لائن

فہرست

اظہار تشکر

ہم ان تمام افراد کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں جنہوں نے اس کتاب کی تیاری میں کوئی کردار ادا کیا۔ سب سے پہلے ہمارے طلباء ہیں جو ایسے معاملات پر ہمارے مل بیٹھنے کی بنیادی وجہ ہیں۔ بالخصوص ڈیوڈ ڈور، لی نورا فشر، واسیا جورجیوا، ایڈم لینک فورڈ اومیتھیو پاول کا اس پراجیکٹ کے لیے جذبہ اور عزم قابل ستائش ہے جس سے ہمیں آج کے طالب علم کی روح پرکھنے کا اعتماد حاصل ہوا، خصوصی طور پر ایسے طلباء جو واشنگٹن ڈی سی کے علاقے میں مکالمے کے آغاز کے اصول واضح کر رہے ہیں۔ ہمارے ساتھی اور سکول آف انٹرنیشنل کے ڈین لوئیگڈ مین اور سکول آف پبلک آفیئر ز کے ڈین ولیم ایم لیوگرینڈ اس تمام عرصے کے دوران نہایت مشفقانہ طور پر معاون رہے اور ہمیں مفید مشوروں سے نوازا، اس کے علاوہ اکیڈمک افیئر ز کے ڈین آئیوی براڈر اور پرووسٹ نیل کروین کا ذکر کرنا بھی نہایت ضروری ہے جنہوں نے اس کتاب میں شامل مضامین میں پیش کیے گئے خیالات کے فروغ کے لیے کانفرنس کے انعقاد میں زبردست مدد کی، امریکن یونیورسٹی کے صدر بنجمن لیڈنر کی عالمی سطح کی بصیرت نے اس پراجیکٹ کے لیے قابل قبول ماحول کی تشکیل میں جو کردار ادا کیا اس کی تعریف کرنا بھی لازم ہے۔

ہماری خواہش ہے کہ ہم کتاب کے پبلشر پولائٹی پریس، بالخصوص لوئی نائٹ کا شکریہ ادا کریں جنہوں نے کتاب کی ایڈیٹنگ کے ابتدائی مرحلے میں اس خیال کی تحسین کی، اس طرح آندریا ڈرگن سارہ ڈینسی اور جین وین الٹینا نے مسودے کی تیاری میں پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ ہماری معاونت کی۔

کتاب کے لیے مضامین تحریر کرنے والوں سے اظہار تشکر ہم پر ایک بڑا قرض ہے۔ ایک فعال مستقبل کی تشکیل کے لیے عزم کرتے ہوئے ان صاحبان نے یہ کتاب لکھی۔ ایسی غیر معمولی

شخصیات کی طرف سے تعاون کا حصول ہمارے لیے باعث مسرت ہے۔ ہمارے لیے یہ امر مسحور کن ہے کہ کس طرح ہر مضمون نگار نے درپیش چیلنج پر ردعمل ظاہر کیا اور اپنا اپنا حصہ ڈالا۔

آخر میں ہم دونوں کو اپنی بیویوں جوڈتھ فورسٹ اور زینت احمد کا دل کی گہرائی سے شکریہ ادا کرنا ہے۔ جنہوں نے اس پراجیکٹ میں بھرپور تعاون کیا۔حقیقت یہ ہے کہ ان کی غیرمتزلزل حمایت، محبت اور صبر کو مناسب طریقے سے الفاظ میں بیان کرنا ہمارے لیے نہایت مشکل ہے۔ انہوں نے ہمارے بچوں کو نہ صرف جنم دیا بلکہ ان کی پرورش بھی کی۔ اس کے بدلے ان کے بچوں جن کے نام ہم نے کتاب منسوب کی ہے، نے بھی اسی محبت اور رچاہت کا مظاہرہ کیا، اس طرح ہمارے پوتے، پوتیاں بھی ہیں، ہم امید کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ ہماری نسل کے برعکس بنی نوع انسان کا اچھے طریقے سے بہتر سمت میں جائزہ لیں۔



مضمون نگاروں کا مختصر تعارف

اکبر احمد:

امریکن یونیورسٹی واشنگٹن ڈی سی میں شعبہ اسلامک سٹڈیز کی ابن خلدون چیئر کے سربراہ اور انٹرنیشنل ریلیشنز کے پروفیسر ہیں۔ وہ برطانیہ میں2000-1999 کے دوران پاکستان کے ہائی کمشنر تعینات رہ چکے ہیں۔ اکبر احمد ایک ممتاز انتھراپولوجسٹ' فلمساز اور عصری اسلام پر کئی کتابوں اور مضامین کے مصنف ہیں۔ ان کی مشہور تصانیف میں ''اسلام انڈر سیج'' (2003) اور ''ڈسکورنگ اسلام' میکنگ سینس آف مسلم ہسٹری اینڈ سوسائٹی'' (1988) (جو بی بی سی کی 6 حصوں پر مشتمل ڈاکومنٹری ''لیونگ اسلام'' کی بنیاد بنی) شامل ہیں' ان کی تخلیق ''پوسٹ ماڈرنزم اینڈ اسلام' (1942) ایمالفی ایوارڈ کے لیے نامزد ہوئی جبکہ ''اسلام ٹوڈے: اے شارٹ انٹروڈکشن ٹو دی مسلم ورلڈ'' (1999) کو ''لاس اینجلس ٹائمز'' کی طرف سے سال کی بہترین نان فکشن کتاب قرار دیا گیا' اس طرح بانی پاکستان قائداعظم پر تخلیق ''جناح کو آرٹ'' کو کئی بین الاقوامی انعامات سے نوازا گیا۔ اکبر احمد بین المذاہب مکالمے میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے۔ انہوں نے عالمی اسلام اور اس کے ہم عصر معاشروں پر اثرات کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے۔ انہوں نے ''دی فیوچر آف انتھراپولوجی (1995) سمیت کئی کتابوں کی ایڈیٹنگ کا بھی کام کیا ہے' امریکن یونیورسٹی سے منسلک ہونے سے قبل وہ پرنسٹن یونیورسٹی' ہارورڈ یونیورسٹی اور کیمبرج یونیورٹی کے وزیٹنگ پروفیسر بھی رہے۔ موخرالذکر یونیورسٹی میں وہ 5 برس تک اقبال فیلو بھی رہے۔ حکومت پاکستان انہیں ان کی خدمات کے اعتراف میں ''ستارہ امتیاز'' دے چکی ہے جبکہ رائل سوسائٹی آف ایشین آفیئرز لندن نے انہیں

سرپرسی سائیکس میموریل میڈل عطا کیا' انہیں حال ہی میں ورلڈفیتھز ڈویلپمنٹ ڈائیلاگ کا ٹرسٹی مقرر کیا گیا ہے۔ یہ فورم آرچ بشپ آف کنٹربری کی زیرنگرانی کام کر رہا ہے۔ اس طرح اکبر احمد کو واشنگٹن ڈی سی میں 2002ء میں مسلم پبلک افیئرز کونسل کی طرف سے فری مینیج ایوارڈ بھی دیا گیا۔ انہوں نے یونیورسٹی آف لندن سے ''انتھراپولوجی'' میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ۔ انہیں 2004ء میں کارنیگی فاؤنڈیشن کی طرف سے کولمبیا کا ڈسٹرکٹ پروفیسر تعینات کیا گیا۔

کوفی عنان:

اقوام متحدہ کے (کتاب کی تحریر کے وقت) سیکرٹری جنرل ہیں۔ انہیں 1997ء میں اس منصب کے لیے منتخب کیا گیا اور وہ عالمی ادارے کے پہلے سربراہ ہیں جن کی نامزدگی اقوام متحدہ کے سٹاف میں سے کی گئی۔ 1962ء میں اقوام متحدہ سے منسلک ہونے کے بعد کوفی عنان نے اس ادارے کی کارکردگی بہتر کرنے کے لیے جامع اصلاحات کا پروگرام شروع کیا' جس کے تحت امن و سلامتی کے قیام' انسانی حقوق' قانون کی حکمرانی' مساوات کی عالمی اقدار' انسانی وقار اور اقوام متحدہ پر لوگوں کا اعتماد بحال کرنے کی حوصلہ افزائی کی گئی' ان کا نعرہ تھا ''اقوام متحدہ کو لوگوں کے قریب لاؤ'' اقوام متحدہ کے چارٹر میں درج ان تمام مقاصد کے حصول کی جدوجہد پر کوفی عنان کو 2001ء میں امن کا نوبل انعام دیا گیا۔ نوبل کمیٹی نے انہیں نامزد کرتے ہوئے یہ ریمارکس دیئے ''مسٹر عنان نے تنظیم میں نئی روح پھونکنے کے لیے اہم کردار ادا کیا۔''

بنجمن آر باربر:

یونیورسٹی آف میری لینڈ میں سول سوسائٹی کے پروفیسر اور ڈیموکریسی کولیبوریٹو کے پرنسپل ہیں۔ اس تھنک ٹینک کے دفاتر نیویارک' واشنگٹن اور میری لینڈ یونیورسٹی میں ہیں۔ ڈاکٹر باربر عالمی سطح پر سیاسیات کا ایک ممتاز نام ہے۔ انہوں نے امریکہ اور دیگر ممالک میں جمہوریت' شہریت' سیاسیات' کلچر اور تعلیم کے شعبے میں بیداری پیدا کرنے کا کام کیا۔ آپ کی 17 تصانیف میں سٹرانگ ڈیموکریسی (کیلی فورنیا یونیورسٹی 1984)' بیسٹ سیلر کتاب جہاد بمقابلہ میک ورلڈ (یہ کتاب پہلے 1995 میں شائع ہوئی' تاہم نائن الیون کے بعد 2001 میں اس کا نیا ایڈیشن آیا اور 20

زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا) شامل ہیں۔ پروفیسر بنجمن باربر کو فرانسیسی حکومت کی طرف سے پالز اکیڈمکس کا ایوارڈ ملا۔(2001) اس کے علاوہ وہ امریکن اکیڈمی آف برلن کے برلن پرائز(2001) اور جان ڈیوی ایوارڈ(2003) کے حقدار ٹھہرے۔

ایمیٹائی زیونی:

بین الاقوامی سطح پر پہچانے جانے والے سکالر اور سوشل پالیسی ایشوز پر کئی کتابوں اور مضامین کے مصنف ہیں۔ وہ 20 سال تک کولمبیا یونیورسٹی میں سوشیالوجی کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔ انہوں نے 1958ء میں کیلی فورنیا یونیورسٹی سے سوشیالوجی میں پی ایچ ڈی کیا تھا' ڈاکٹر ایمیٹائی 1979-80 میں وائٹ ہاؤس کے سینئر مشیر برائے داخلی امور رہے۔ 1980 میں وہ جارج واشنگٹن یونیورسٹی کے پہلے پروفیسر مقرر ہوئے جہاں وہ انسٹی ٹیوٹ آف Communitarian پالیسی کے سربراہ رہے۔ 1987ء سے 1989ء تک انہوں نے ہارورڈ بزنس سکول میں کیرول فورڈ فاؤنڈیشن کے پروفیسر کے طور پر خدمات سرانجام دیں۔ 1989-90ء میں آپ انٹرنیشنل سوسائٹی فار ایڈوانسمنٹ آف سوشیو اکنامکس کے بانی صدر مقرر ہوئے۔ 1990ء میں ہی ڈاکٹر ایمیٹائی زیونی نے غیر منافع بخش اور خودمختار تنظیم Communitarian Network بنائی اور معاشرے میں اخلاقی و سیاسی شعور بیدار کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ وہ اسی تنظیم کے رسالے The Responsive Conmmunity کے مدیر ہیں۔ آپ کی 22 کتابوں میں دی مونوکروم سوسائٹی (2001) ' دی نیو گولڈ رول (1996)' دی سپرٹ آف کمیونٹی (1993)' دی مورل ڈائمنشن (1988) اور فرام ایمپائر ٹو کمیونٹی (2004) شامل ہیں۔

برائن فورسٹ:

امریکن یونیورسٹی کے سکول آف پبلک آفیئرز میں قانون' انصاف و معاشرہ کے پروفیسر ہیں۔ انہوں نے انسٹی ٹیوٹ آف لا اینڈ سوشل ریسرچ اور پولیس فاؤنڈیشن کے ریسرچ ڈائریکٹر کے طور پر 20 سال تک غیر منفعت بخش تحقیق کی۔ 1989ء میں انہوں نے جارج واشنگٹن یونیورسٹی کی فیکلٹی میں شمولیت اختیار کی اور پھر 1992ء میں امریکن یونیورسٹی کے فیکلٹی ممبر بنے۔ انہوں نے کئی

کتابیں لکھیں، جن میں ''ایرر آف جسٹس، نیچر، سورس اینڈ ریمیڈیز، (2004) دی پرائیویٹائزیشن آف پولیسنگ: ٹوویوز (1999) اور پاور ان نمبرز (1987) شامل ہیں۔ اس کے علاوہ برائن فورسٹ نے کئی مضامین، متعدد کتابوں کے ابواب اور آرٹیکل تحریر کیے۔ وہ اس وقت جسٹس لاً اینڈ سوسائٹی ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ، فیکلٹی سینٹ کے رکن اور یونیورسٹی آرکسٹرا کے ممبر ہیں، انہیں ان کی خدمات کے اعتراف میں 2002ء میں برنارڈ ایچ راس ٹیچنگ ایکسی لینس ایوارڈ دیا گیا، ڈاکٹر فورسٹ نے یونیورسٹی آف کیلی فورنیا اور (لاس اینجلس) سے بی ایس اور ایم بی اے کی ڈگریاں لیں جبکہ پی ایچ ڈی جارج واشنگٹن یونیورسٹی سے کیا۔

راج موہن گاندھی:

یونیورسٹی آف ایلنوائے میں پولیٹیکل سائنس کے وزیٹنگ پروفیسر اور گلوبل کراس روڈ پروگرام کے ڈائریکٹر ہیں۔ وہ مہاتما گاندھی کے پوتے اور عالمی سطح پر انسانی حقوق کے ممتاز سرگرم کارکن ہیں۔ اس کے علاوہ وہ نورم برگ ہیومن رائٹس ایوارڈ کی جیوری کے رکن، انٹرنیشنل کونسل، نی شی ایٹرز آف چینج کے ممبر جبکہ سنٹر فار ڈائیلاگ (انڈیا) کے شریک چیئرمین ہیں راج موہن گاندھی بھارتی اخبار ''ہندو'' اور ہندوستان ٹائمز میں لکھتے رہتے ہیں۔ اپنے آبائی وطن بھارت میں ہندو مسلم ہم آہنگی کے فروغ کے لیے ان کے کردار کی حیثیت مسلمہ ہیں، وہ بھارتی ایوان بالا کے رکن بھی رہے، آپ نے کئی کتابیں لکھی ہیں جن میں ''ورلڈ بوٹ مین: اے پورٹریٹ آف گاندھی'' (2000) زیادہ مشہور ہے۔ انہوں نے دہلی کے سینٹ سٹیفنز کالج سے اکنامکس میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔

والٹر آئزک سن:

ایسپن انسٹی ٹیوٹ کے صدر، سی این این نیوز گروپ کے سابق چیف ایگزیکٹو آفیسر اور ٹائم میگزین کے سابق منیجنگ ایڈیٹر ہیں۔ یہ بھی کئی کتابوں اور مضامین کے مصنف ہیں۔ صحافی کی حیثیت سے شہرت حاصل کرنے کے بعد والٹر آئزک سن نے کئی اہم شخصیات مثلاً بنجمن فرینکلن، ہنری کسنجر، ڈین ای: چیسن، ایویرل ہیری مین اور جارج ایف کینن کے حالات زندگی لکھے اور نام پیدا کیا: ان کی حالیہ کتاب ''بنجمن فرینکلن: این امریکن لائف'' (2003) کو زبردست پذیرائی ملی اور اسے ایکبیسٹ سیلر کا درجہ حاصل ہوا۔

☆صدر حجتہ الاسلام محمد خاتمی:

اسلامی جمہوریہ ایران کے پانچویں صدر ہیں۔آپ1943ء میں ممتاز عالم دین آیت اللہ روح اللہ خاتمی کے گھر میں ایرانی شہر اردگان میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے 1961ء میں قم میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور اصفہان یونیورسٹی سے فلسفے میں بی اے کیا۔1970ء میں وہ تہران یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور ایم اے کرنے کے بعد دوبارہ قم واپس آئے اور دوبارہ مذہبی تعلیم کے حصول میں مصروف ہو گئے۔ محمد خاتمی1980ء کے انتخابات میں اردگان اور می بود کے حلقوں سے رکن پارلیمنٹ منتخب ہوئے۔انہیں مرحوم آیت اللہ خمینی نے 1981ء میں کیہان نیوز پیپر انسٹی ٹیوٹ کا سربراہ مقرر کیا۔ 1992ء میں انہیں صدر ہاشمی رفسنجانی کا مشیر ثقافت مقرر کیا گیا' اس کے ساتھ ساتھ ایران نیشنل لائبریری کی سربراہی تفویض کی گئی۔ 1996ء میں آپ ثقافتی انقلاب کی اعلیٰ کونسل کے رکن نامزد ہوئے اور ان دنوں صدر کی حیثیت سے اس کونسل کے سربراہ ہیں۔صدر خاتمی نے ثقافتی اور سماجی موضوعات پر کئی کتابیں اور مضامین تحریر کیے ہیں۔1998ء میں اقوام متحدہ سے خطاب میں انہوں نے تجویز دی کہ 2001ءکو ثقافتوں کے مابین مکالمے کا سال قرار دیا جائے۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ اس قسم کے مکالمے سے عالمی سطح پر انصاف اور آزادی کے حصول میں مدد ملے گی۔

برنارڈ لیوس:

پرنسٹن یونیورسٹی میں شعبہ مشرق قریب کے پروفیسر ہیں۔ انہیں پورے مغرب میں ایک ممتاز مستشرق اور اسلامی تاریخ و ثقافت پر اتھارٹی سمجھا جاتا ہے۔ وہ1974ء تک لندن یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے اور اس کے بعد1986ء تک انہوں نے پرنسٹن یونیورسٹی میں خدمات سرانجام دیں۔ ''دی عرب ان ہسٹری'' (1950)' ''دی ایمرجنس آف ماڈرن ترکی'' (1961)' 'دی اسیسنز''(2002) ''دی مسلم ڈسکوری آف یورپ''(1985)' ''دی پولیٹیکل لینگویج آف اسلام'' (1988)' ''ریس اینڈ سلیوری ان دی مڈل ایسٹ'' (1992)' ''اسلام اینڈ دی ویسٹ''

☆ایران کے سابق صدر' ان دنوں محمود احمدی نژاد ملک کے صدر ہیں۔مترجم

(1993)' ''اسلام ان ہسٹری''(2001)' ''دی شیپنگ آف دی ماڈرن مڈل ایسٹ''(1994)' کلچران کانفلیکٹ''(1996)' ''دی مڈل ایسٹ: اے بریف ہسٹری آف لاسٹ 2000 ایئرز'' (1995)' ''دی فیوچر آف دی مڈل ایسٹ''(1999)' A Middle East Mosaic: Fragments of Life (2008) ''وٹ وینٹ رانگ؟''(2003) اور دی کرائسس آف اسلام'' ان کی مشہور کتابیں ہیں' ''نیویارکر'' اور اٹلانٹک'' میگزین میں شائع ہونے والے ان کے مضامین کو انتہائی پسند کیا جاتا ہے' اور ان مضامین میں تہذیبوں میں تصادم کے حوالے سے مغرب کے دلچسپی کا کافی مواد جمع ہوتا ہے۔ان کی کتاب''دی مسلم ڈسکوری آف یورپ'' کا اُردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

مارٹن مارٹی:

یونیورسٹی آف شکاگو میں 35 سال تک پروفیسر کی حیثیت سے پڑھاتے رہے۔اس کے علاوہ وہ پارک رج سنٹر میں صحت' عقیدے اور اخلاقیات کے شعبے میں سینئر سکالر کے طور پر کام کرتے رہے۔انہوں نے 50 سے زائد کتابیں تحریر کی ہیں۔جن میں 3 جلدوں پر مشتمل ماڈرن امریکن ریلیجن (1997)' وی ون اینڈ دی مینی (1998)' ایجوکیشن' ری لیجن اینڈ دی کامن گڈ (2000)' پلیسس الانگ دی وے (1994) اور When True Simplicity is Gained (1998) شامل ہیں' ان کی کتاب Righteous Empire (1977) کو نیشنل بک ایوارڈ ملا' مارٹن لوتھر (2004) ایک اور اہم تصنیف ہے۔مارٹن مارٹی امریکن اکیڈمی آف ری لیجن کے صدر بھی رہے اور انہیں کئی انعامات سے نوازا گیا۔جن میں نیشنل ہومینیٹز ایوارڈ میڈل اور میڈل آف دی امریکن اکیڈمی آرٹس شامل ہیں۔وہ 2 صدراتی کمشنوں کے بھی ممبر رہ چکے ہیں۔

عالی مرتبت ملکہ نور آف اردن:

1951ء میں لیزا نجیب حلبی کے نام سے ایک ممتاز عرب امریکی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ پہلے انہوں نے لاس اینجلس' واشنگٹن' نیویارک اور میساچوسٹس کے مختلف سکولوں میں تعلیم حاصل کی پھر پہلی بار پرنسٹن یونیورسٹی میں مخلوط کلاسوں میں داخلہ لیا' یہاں سے اربن پلاننگ اور آرکیٹکچر کی

ڈگری حاصل کرنے کے بعد انہوں نے آسٹریلیا' ایران' امریکہ اور اردن میں کئی بین الاقوامی اربن پلاننگ کے منصوبوں میں حصہ لیا۔محترمہ نور نے 1978ء میں اردن کے شاہ حسین سے شادی کی ۔ملکہ نور نے مشرق وسطی اور عرب مغرب تعلقات کے فروغ میں ثالثی کا نہایت اہم کردار ادا کیا۔اس کے علاوہ کئی عالمی ایشوز کے حل میں سرگرمی سے حصہ لینے کے ساتھ ساتھ انہوں نے متعدد بین الاقوامی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کی ۔ آپ نے 1985ء میں نورالحسین فاؤنڈیشن قائم کیا اور خواتین و بچوں کی فلاح' تعلیم اور صحت کے لیے بین الاقوامی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔

جوزف ایس نائے جونیئر:

ہارووڈ یونیورسٹی کے کینیڈی سکول کے سابق ڈین اور پبلک پالیسی کے ڈون کے پروفیسر ہیں۔ انہوں نے 1964ء میں استاد کی حیثیت سے ہارورڈ یونیورسٹی میں شمولیت اختیار کی اور سنٹر فار انٹرنیشنل آفیئر ز کے ڈائریکٹر اور آرٹس و سائنس کے ایسوسی ایٹ ڈین کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔ 1977ء سے 1979ء کے دوران جوزف ایس نائے جونیئر امریکہ کے ڈپٹی انڈر سیکرٹری برائے خارجہ سیکیورٹی' سائنس اینڈ ٹیکنالوجی رہے۔ وہ ایٹمی عدم پھیلاؤ کے گروپ کے سربراہ کے طور پر بھی کام کرتے رہے' نائب وزیر دفاع برائے بین الاقوامی امور وسلامتی اور نیشنل انٹیلی جنس کونسل کا سربراہ رہنے کے بعد وہ 1995ء میں دوبارہ ہارورڈ یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے۔ ان کی حالیہ تصانیف میں سافٹ پاور (2004)' انڈرسٹینڈنگ انٹرنیشنل کونفلکٹس' چوتھا ایڈیشن (1999)' پاور اینڈ انٹرڈیپنڈنس (2000)' رابرٹ اور کیوہان کے ساتھ ان کی مشترکہ تحقیق' فار دی پیپل (2003) شامل ہیں۔ پروفیسر نائے نے پرنسٹن یونیورسٹی سے گریجوایشن کی ڈگری حاصل کی اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے رہوڈز سکالرشپ پر ایم اے کیا جبکہ ہارورڈ ونیورسٹی سے پولیٹیکل سائنس میں پی ایچ ڈی کیا' وہ امریکین اکیڈمی آف آرٹس اینڈ سائنس اور اکیڈمی آف ڈپلومیسی کے فیلو ہیں۔ پروفیسر جوزف نائے ایسپن انسٹی ٹیوٹ کے سینئر فیلو اور ایسپن سٹریٹجی گروپ کے ڈائریکٹر رہ چکے ہیں۔

جوڈیا پرل:

1970ء سے کیلی فورنیا یونیورسٹی میں آرٹی فیشیل انٹیلی جنس کے پروفیسر ہیں۔عقلیت پر کئی انعام یافتہ کتابوں اور مضامین کے مصنف ذہنی رجحانات، رنگ سٹرٹیجی اور آلٹرنیٹوسسٹم آف لاجک پر تحقیق کے بانی ہیں تاہم ان کی وجہ شہرت مشہور امریکی صحافی ڈینیل پرل کا والد ہونا ہے جنہیں کراچی میں2002ء میں دہشت گردوں نے قتل کر دیا تھا۔اس واقعے کے بعد پروفیسر جوڈیا پرل نے خود کو بین العقائد مکالمے کے لیے واقف کر دیا۔ اس ضمن میں ان کے پروفیسر اکبر احمد کے ساتھ کئی مباحثے ہوئے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''نفرت نے میرے بیٹے کی جان لی اور میں آخر دم تک نفرت کے خلاف لڑوں گا'' وہ ڈینیل پرل فاؤنڈیشن کے صدر ہیں، جس کا قیام مختلف ثقافتوں کے درمیان ہم آہنگی کے فروغ کے لیے عمل میں لایا گیا۔ جوڈیا پرل نے 1960ء میں حیفہ (اسرائیل) سے انجینئرنگ میں بیچلر ڈگری حاصل کی، 1965ء میں انہوں نے فزکس میں ایم اے کیا اور اسی برس الیکٹریکل انجینئرنگ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

جوناتھن ساکس:

دولت مشترکہ کے رکن ممالک میں یہودیوں کی تنظیم کے چیف ربی ہیں۔ان کا اس منصب پر تقرر1991ء میں ہوا۔1845ء کے بعد چیف ربی بننے والے وہ چھٹے یہودی عالم ہیں۔گان ولی اور کائیس کالج کیمبرج سے فلسفے میں فرسٹ کلاس پوزیشن میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ربی ساکس Jonathan Sacks نے گریجوایشن کی تعلیم کے لیے نیو کالج آکسفورڈ اور کنگز کالج لندن میں داخلہ لیا۔ وہ کافی عرصے تک یونیورسٹی آف ایسیکس، مانچسٹر یونیورسٹی، نیوکاسل یونیورسٹی، آکسفورڈ، ایڈانبرا اور سینٹ اینڈریو میں طلباء کو فلسفہ پر لیکچر دیتے رہے۔ ان دنوں وہ کنگز کالج لندن میں تھیولوجی کے وزیٹنگ لیکچرار ہیں۔ چیف ربی کی حیثیت سے 10 سال مکمل کرنے پر ستمبر 2001ء میں آرچ بشپ آف کنٹربری نے جوناتھن ساکس کو الوہیت پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی۔ان کی تصانیف میں ''دی ڈگنٹی آف ڈیفرنس'' (2003)، دی پالیٹیکس آف ہوپ(1997)، سیلی بریٹنگ لائف (2004)، آرگومنٹس فار دی سیک آف ہیون (1991)، فیتھ ان دی فیوچر

(1995)' اے لیٹران دی سکرول(2000)' فرام آپٹمزم ٹو ھوپ(2004) اور دیگر شامل ہیں۔
ان کی کتاب دی ڈگنٹی آف ڈیفرنس' پر تبصرہ کرتے ہوئے دی ڈیلی ٹیلی گراف لکھتا ہے کہ ''یہ تہذیبوں کے درمیان نام نہاد تصادم اور گلوبلائزیشن کے موضوع پر کتابوں میں ارفع کتاب ہے۔''

روی شنکر:

دنیا کے انتہائی جانے پہچانے اور پسند کیے جانے والے موسیقار ہیں۔ بھارت میں گورو بابا علاؤالدین کی شاگردی میں ستار کی تربیت لینے کے بعد انہوں نے 1960ء میں مشہور گروپ The Beatles میں شمولیت اختیار کی۔ بعدازاں انہوں نے عالمی شہرت یافتہ مغربی موسیقاروں لارڈ یہودی مینوہن' جین پائرے رامپال' فلپ گلاس اور دیگر کئی کے ساتھ وابستگی رکھی۔ لارڈ مینوہن نے سر روی شنکر کو اس طرح خراج تحسین پیش کیا۔ ''روی شنکر نے مجھے ایک بیش بہا تحفہ دیا اور ان کے ذریعے مجھ پر اپنے موسیقی کے تجربے میں نئے پہلو آشکارہ ہوئے۔ میرے نزدیک ان کی انسان نوازی اور فنی مہارت کا موازنہ صرف موتزارٹ سے کیا جا سکتا ہے۔'' سر روی شنکر امریکن اکیڈمی آف آرٹس اینڈ لیٹرز کے اعزازی رکن ہے' وہ اقوام متحدہ کے بین الاقوامی کمپوزر گروپ کے بھی ممبر ہیں۔انہیں بھارت اور کئی دیگر ممالک کی طرف سے ایوارڈ بھی ملے۔ 14 اعزازی ڈاکٹریٹ ڈگریوں کے علاوہ ان کے اعزازات میں پدما وبھوشن ڈیسی کوٹم' میگسا سے سے ایوارڈ ملیلا' 3 گریمی ایوارڈ' فوکویوکا گرینڈ پرائز جاپان' کرسٹل ایوارڈ ڈیووس اور 1986ء میں عالمی سفیر کا اعزاز شامل ہیں۔ انہیں 1986ء میں بھارت کے ایوان بالا راجیہ سبھا کا رکن نامزد کیا گیا۔ ملکہ برطانیہ نے روی شنکر کو ''سر'' کا اعزاز دیا۔ اب 80 کے پیٹے میں بھی روی شنکر اپنے خاندان کے دیگر افراد اور موسیقاروں کے ساتھ دنیا بھر کے دورے کر کے ستار بجاتے ہیں۔

تمارا سون:

ولیم اینڈ میری کالج میں مذہب اور ہومینی ٹیز کی خاتون پروفیسر ہیں۔ انہیں معاصر دنیا میں اسلامی انٹلیکچوئل تاریخ کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ان کی مشہور کتابوں میں ''بیٹوین قرآن اینڈ کراؤن'' (1990)' ''انٹرپریٹنگ اسلام'' (1996)' ''اسلام اینڈ کوئچن آف مینارٹیز'' (1996)' ''

کمپیئرنگ ریلیجنز تھر ولا: جوڈا ازم اینڈ اسلام'' (1999)' ''جوڈا ازم اینڈ اسلام ان پریکٹس'' (2000) شامل ہیں۔ پروفیسر تمارا سون نے آکسفورڈ انسائیکلو پیڈیا آف ماڈرن اسلامک ورلڈ اور کولیئرز انسائیکلوپیڈیا میں معاونت کرنے کے ساتھ ساتھ کئی مضامین اور کتابوں کے ابواب لکھے۔انہوں نے یورپ' مشرق وسطیٰ' افریقہ اور ایشیا کے کئی ملکوں میں لیکچر بھی دیئے۔ وہ امریکن کونسل فار سٹڈی آف اسلامک سوسائٹیز کے بورڈ آف ڈائریکٹر کی رکن اور امریکن اکیڈمی آف ریلیجن (مشرقی ڈویژن) کی سابق نائب صدر ہیں' انہوں نے یونیورسٹی آف سانتا لارا سے فلسفے میں بی اے اور ٹورانٹو یونیورسٹی سے ایم اے کیا جبکہ پی ایچ ڈی آپ نے شکاگو یونیورسٹی سے کی۔

ڈیم مریلین سٹراتھن:

کیمبرج یونیورسٹی میں انتھراپولوجی کی پروفیسر اور گرٹن کالج میں ''مسٹرس'' ہیں۔ انہیں صنف' معاشرے' قرابت داری اور انٹلیکچوئل پراپرٹی رائٹس پر بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ انہوں نے اپنی ریسرچ کا زیادہ تر کام پاپوانیوگنی اور انگلینڈ میں انجام دیا۔سکول میں روسو کو پڑھتے اور جنوبی برطانیہ کے آثار قدیمہ کی سیر کرتے ہوئے ان کے اندر انتھراپولوجی (رائل انتھراپولوجیکل) کے بارے میں دلچسپی پیدا ہوئی اس کے بعد انہوں نے بی اے' ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں کیمبرج یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ 1971ء میں ان کی تحریر ''سیلف ڈیکوریشن ان ماؤنٹ ہیگن'' اور اگلے سال ''ویمن ان بیٹوین'' شائع ہوئی' 1976ء میں ڈیم مریلین سٹراتھن کو رائل انتھراپولوجیکل انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ریورز میموریل میڈل پیش کیا گیا جبکہ 2003ء میں انہیں ویز گرن انسٹیٹیوٹ کے لائف ٹائم اچیومنٹ میڈل سے نوازا گیا۔ 1995ء سے 1993ء تک وہ یونیورسٹی آف مانچسٹر میں انتھراپولوجی شعبے کی سربراہ رہیں۔ 90ء کے عشرے میں ان کی 5 کتابیں شائع ہوئیں۔ جن میں پارشل کنیکشن آفٹر نیچر' ری پروڈیوسنگ دی فیوچر' ٹیکنالوجیز آف پروکری ایشن اور پراپرٹی سبسٹانس اینڈ ایفیکٹ شامل ہیں۔ 1996ء میں امریکن آرٹس اینڈ سائنس اکیڈمی نے انہیں اعزازی غیر ملکی رکن نامزد کیا۔

شہزادہ حسن بن طلال:

اردن کے سابق ولی عہد ہیں' وہ 1947ء میں اس وقت کے ولی عہد شہزادہ طلال بن عبداللہ اورشہزادی زین الشریف بنت جمیل کے ہاں پیدا ہوئے۔ بعدازاں ان کے والدین اردن کے تخت پر جلوہ افروز ہوئے۔ وہ مرحوم شاہ حسین کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ہاشمی سلسلے کی 42ویں پشت میں ان کے خاندان کی کڑی حضرت محمدؐ سے مل جاتی ہے۔ بین العقائد ہم آہنگی اور مکالمے کے حوالے سے شہزادہ حسن بن طلال کو عالمی سطح پر اہم مقام حاصل ہے۔ 1994ء میں شاہ اردن نے اردن میں رائل انسٹیٹیوٹ فار انٹرفیتھ ڈائیلاگ قائم کیا اور 1999ء میں عمان میں امن و مذہب پر ورلڈ اسمبلی کا ساتواں اجلاس ہوا' شہزادہ حسن بن طلال کو اس کانفرنس کا منتظم مقرر کیا گیا۔ انہوں نے 7 کتابیں اور کئی مضامین لکھے۔ جن میں اے سٹڈی آن یروشلم (1979) فلسطینین سیلف ڈیٹرمینیشن (1981)' سرچ فار پیس (1984)' عرب میں عیسائیت (1994)' (2001) Confinuity, Innorvation & Change' فیصل اول کی یاد میں: عراقی نکتہ (2003) شامل ہیں۔ شاہ حسین نے شہزادہ حسن بن طلال کو 1965ء میں مملکت کا ولی عہد مقرر کیا۔ وہ شاہ اردن کے بااعتماد اور قریبی سیاسی مشیر کے طور پر کام کرتے رہے۔ انہوں نے شاہ کی بیرون ملک روانگی کی صورت میں ان کے قائم مقام کی حیثیت سے خدمات بھی انجام دیں۔

ششی تھرور:

اقوام متحدہ کے کمیونیکشن اور پبلک انفارمیشن کے شعبے کے انڈر سیکرٹری جنرل ہیں۔ وہ 1956ء میں لندن میں پیدا ہوئے اور تعلیم بھارت اور امریکہ سے حاصل کی۔ (سینٹ سٹیفنز کالج سے بی اے کیا)۔ انہوں نے امریکہ میں 22 سال کی عمر میں تفتس یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی اور 1978ء سے اقوام متحدہ سے منسلک رہے۔ پہلے وہ سنگاپور میں یو این ہائی کمیشن برائے پناہ گزین کے سٹاف کے طور پر کام کرتے رہے۔ 1989ء سے انہیں نیویارک میں مرکزی دفتر میں اعلیٰ پوزیشن حاصل ہے اور وہ اقوام متحدہ کے امن مشنوں کے معاملات کی نگرانی کر رہے ہیں۔ 1997ء سے 1998ء تک وہ سیکرٹری جنرل کوفی عنان کے ایگزیکٹو اسسٹنٹ رہے۔ 1998ء میں انہیں

سیکرٹری جنرل کے دفتر میں ڈائرکٹر کمیونیکشن مقرر کیا گیا۔2001ء میں ششی تھرور کو اطلاعات عامہ کے شعبے کا عارضی سربراہ نامزد کیا گیا اور 2002ء میں انہیں انڈر سیکرٹری جنرل کے طور پر کنفرم کر دیا گیا۔ ڈاکٹر تھرور کئی مضامین' افسانوں' تبصروں کے مصنف ہیں۔ انہیں کئی ادبی ایوارڈوں سے نوازا گیا۔ ان کی کتابوں میں ریزنز آف سٹیٹ (1981)' دی گریٹ انڈین ناول (1989)' اور Riot قابل ذکر ہیں۔ ششی تھرور کے ناول Show Business (1993) پر نیویارک ٹائمز نے صفحہ اول پر تبصرہ کیا۔

آرچ بشپ ڈیسمنڈ توتو:

انہیں جنوبی افریقہ میں مذہبی منافرت کا مسئلہ حل کرنے میں مثالی کردار ادا کرنے پر 1984ء میں امن کا نوبل انعام دیا گیا۔ نوبل کمیٹی نے جنوبی افریقہ کی آزادی کے لیے ڈیسمنڈ توتو کے عدم تشدد پر مبنی کردار کو اس طرح سراہا ''یہ ایسی جدوجہد ہے جس میں جنوبی افریقہ کی سفید فام اور سیاہ فام آبادی نے متحد ہو کر اپنے ملک کو تصادم اور بحران سے نکالا۔'' ڈیسمنڈ توتو 1931ء میں ٹرانسوال میں پیدا ہوئے اور جوہانسبرگ میں تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے یونیورسٹی آف ساؤتھ افریقہ سے 1954ء میں گریجوایشن کی۔ ہائی سکول میں معلم کی حیثیت سے 3 سال خدمات سرانجام دینے کے بعد انہوں نے مذہبی تعلیم کا حصول شروع کیا اور 1960ء میں ایک راہب بن گئے۔ انگلینڈ میں 1962-66ء مزید 4 سال تک مذہبی علوم کا مطالعہ کر کے انہوں نے تھیولوجی میں ایم اے کر لیا۔ 1967ء سے 1972ء تک مسٹر توتو نے جنوبی افریقہ میں مذہب پڑھایا اور پھر واپس انگلینڈ جا کر تھیالوجیکل انسٹی ٹیوٹ لندن میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر لگ گئے۔ انہیں 1975ء میں سینٹ میری کیتھیڈرل کا ڈین مقرر کیا گیا۔ وہ اس عہدے پر فائز ہونے والے پہلے سیاہ فام تھے۔ ڈیسمنڈ توتو 1976ء سے 1978ء میں لیسوتھو کے بشپ رہے اور 1978ء میں جنوبی افریقہ کی چرچ کونسل کے پہلے سیاہ فام جنرل سیکرٹری مقرر ہوئے۔ انہیں امریکہ' برطانیہ اور جرمن کی کئی یونیورسٹیوں نے اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی ہے۔ آپ کی کئی تصانیف میں ''نو فیوچر ود آؤٹ فارگیونیس' (2000) ''گاڈ ہیز اے ڈریم'' (2004) مشہور ہیں۔

ولیم ایل یوری:

ہارورڈ یونیورسٹی لاسکول میں گلوبل نگوسی ایشن پراجیکٹ کے ڈائریکٹر اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ انہوں نے دنیا کے کئی ملکوں میں حکومتی اور کمیونٹی سطح پر ثالث اور مشیر کے طور پر کام کیا ہے۔ پروفیسر یوری کی ریسرچ کا محور تباہ کن تنازعات کو مثبت عمل میں تبدیل کرنا ہے۔ اپنی تحقیق سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ عوامی حلقوں کو متحرک کر کے تنازعات سے بچاؤ کے علاوہ ان کے حل میں موثر مدد لی جاسکتی ہے۔ ان کی سرگرمیوں میں لسانی تفاوت کے سدباب کے امور بھی شامل ہیں۔ ان کے پراجیکٹوں میں سے ایک گلوبل ای پارلیمنٹ کی تشکیل ہے۔ جس کا مشن منتخب نمائندوں کو عوامی رابطوں سے مربوط کر کے جمہوریت کا استحکام ہے۔ اس طرح سول سوسائٹی کے اشتراک سے مسائل کا موثر حل نکالا جاسکتا ہے۔ وہ سابق امریکی صدر جمی کارٹر کی سربراہی میں انٹرنیشن نگوشی ایشن نیٹ ورک میں بھی خدمات انجام دیتے رہے' وہ عالمی شہریت یافتہ کتاب Getting to Yes (1991) کے شریک مصنف ہیں۔ اس کے علاوہ ''دی تھرڈ سائیڈ'' (2000) اور ''مسٹ وی فائٹ'' ان کی حالیہ کتابیں ہیں۔

سرگیووائراڈی میلو:

12 ستمبر 2002ء سے 19 اگست 2003ء تک اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے ہائی کمشنر رہے۔ انہیں عراق میں تعیناتی کے دوران المناک طور پر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ انہوں نے نہایت کامیابی سے ویت نام' کمبوڈیا' کوسووو' تھائی لینڈ اور مشرقی تیمور میں پناہ گزینوں کی امداد اور بحالی کے امور کی نگرانی کی۔ وہ اپنی ذہانت' حسن ظرافت' رحمدلی اور انسانی ہمدردی کے اصولوں کی بنا پر مشہور تھے۔ سرگیوائرڈی میلو 1948ء میں برازیل کے شہر ریوڈی جنیرو میں پیدا ہوئے۔ یونیورسٹی آف پیرس سے فلسفے اور ہیومینٹیز Humanities کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے 1969ء میں اقوام متحدہ میں شمولیت اختیار کی۔

ان کی ملازمت کا زیادہ تر عرصہ جنیوا میں ہائی کمشنر برائے پناہ گزین کے طور پر گزرا۔ وہ کچھ عرصہ بنگلہ دیش' سوڈان' جرمنی' موزمبیق اور پیرو میں امن فورس اور انسانی امداد کے امور بھی نمٹاتے

رہے۔ 1988ء میں ڈی میلو کو اقوام متحدہ کی ہنگامی امداد کا انڈر سیکرٹری جنرل مقرر کیا گیا۔ مئی 2003ء میں سیکرٹری جنرل نے انہیں کہا کہ وہ چھٹی لے کر عراق میں میرے خصوصی نمائندے کے طور پر کام کریں۔ ان کے آخری الفاظ یہ تھے ''انہیں (مزاحمت کاروں کو) اقوام متحدہ کو عراق سے نکالنے نہ دو' انہیں ہمارا مشن ناکام نہ بنانے دو۔

جوڈی ولیمز:

عالمی امن اور انسانی بنیادوں پر امداد کی بین الاقوامی خاتون کارکن ہیں۔ وسط ایشیا سمیت دنیا کے کئی متاثرہ حصوں میں بارودی سرنگوں کی صفائی کی سرگرمیوں میں نمایاں کردار ادا کرنے پر جوڈی ولیمز کو 1997ء میں امن کا نوبل انعام دیا گیا۔ بارودی سرنگوں پر پابندی کی بین الاقوامی تنظیم کی شریک بانی ہونے کی حیثیت سے انہوں نے 85 ملکوں میں 1300 غیر سرکاری تنظیموں کے ساتھ مہم چلائی۔ اس دوران ان کا حکومتوں' اقوام متحدہ' ریڈ کراس اور کئی سرکاری اداروں سے رابطہ رہا۔ ان کی تنظیم International Campaign to Ban Landmines کی کاوشوں کے نتیجے میں 1997ء میں اوسلو میں منعقدہ سفارتی کانفرنس میں بارودی سرنگوں کے استعمال پر پابندی کے معاہدے کا مقصد حاصل کر لیا گیا۔ وہ اب اس تنظیم کی کمپین سفیر کے طور پر کام کر کے انسان دشمن بارودی سرنگوں پر پابندی کی آواز اٹھا رہی ہیں۔ انہوں نے ماسٹرز کی ڈگری جان ہاپکنز سکول سے حاصل کی۔ اس کے علاوہ ہسپانوی زبان میں ایم اے کیا۔

ایڈورڈ او ولسن:

ہارورڈ یونیورسٹی میں ریسرچ پروفیسر ہیں۔ انہیں انسانی رویے کو ڈھالنے سے متعلق تحقیق' بائیوڈائیورسٹی اور سوشیو بائیولوجی کا بانی سمجھتا ہے۔ پروفیسر ولسن کی ریسرچ وسیع پیمانے پر تخصص سے جنسیاتی پہلوؤں پر محیط ہے۔ انہوں نے چیونٹیوں سے اخلاقیات کی جینیاتیاتی اساس کی ریسرچ کا آغاز کر کے فطری دنیا کی تھیوری کا کام کیا۔ انہیں کتاب ''آن ہیومن نیچر'' (1988) اور ''دی اینٹس'' (1990) پر 2 پولٹزر ایوارڈ دیئے گئے۔ Concilience (1998) ڈی ڈائیورسٹی آف لائف (1993)' دی فیوچر آف لائف (2003) ان کی کتابیں ہیں۔ ان کی کتاب سوشیو بائیولوجی

(1975) نہ صرف جانداروں کے ارتقاء کی ذمہ دار قوتوں کی تفصیل کا خوبصورت بیانیہ ہے بلکہ اس نے 1990ء کی دہائی میں ارتقائی نفسیات کے میدان میں بھی متاثر کن کردار ادا کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ارتقائی عمل میں روحانیت ایک بنیادی چیز اور مستقبل کی امید ہے۔

جیمز ڈی وولفن سوہن:

ورلڈ بینک کے صدر اور ایگزیکٹو ڈائریکٹروں کے بورڈ کے چیئرمین ہیں۔ وہ اس منصب پر 1995ء میں فائز ہوئے۔ سرمایہ کاری بینکاری کے شعبے میں انہیں عالمی سطح پر نمایاں مقام حاصل ہے۔ عالمی بینک کے رکن 184 ممالک میں ادارے کو درپیش چیلنجوں کو سمجھنے کے لیے انہوں نے 100 کے لگ بھگ ممالک کے دورے کیے۔ وہ 1933ء میں آسٹریلیا میں پیدا ہوئے اور پھر امریکہ کی شہریت اختیار کر لی۔ انہوں نے بی اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں سڈنی یونیورسٹی سے حاصل کیں جبکہ ایم بی اے ہارورڈ یونیورسٹی سے کیا۔ انہیں ملکہ برطانیہ نے 1995ء میں ''سر'' کا خطاب عطا کیا۔

حصہ اول

ابتدائیہ

باب 1

ایک زیادہ مہذب اکیسویں صدی کی جانب

اکبر احمد / برائن فورسٹ

11 ستمبر کے واقعات نے عالمی سطح پر لوگوں کو ڈرامائی طور پر تبدیل ہوتی اور خطرناک دنیا سے عہدہ برآ ہونے پر مجبور کر دیا۔ اسی طرح سماجی سائنسدان اور ذمہ دار شہری ہونے کی حیثیت سے ہم بھی بعض مرکزی سوالات سے الجھنے پر مجبور ہوئے۔

- نائن الیون جیسے واقعے کو ہضم کرنے اور آگے بڑھنے سے کیا مراد ہے؟
- ہم تبدیلیوں اور مستقبل کے بارے میں کس طرح سوچ سکتے ہیں؟
- وہ کون سے عالمی نظریات ہیں جو مبہم منظر نامے کی تشریح کرتے ہیں؟
- نفرت کہاں سے وارد ہوتی ہے؟
- ہم نہ ختم ہونے والے تصادم اور تنازع کی رات سے درپیش مایوسی اور اندھیرے کو کیسے چیلنج کر سکتے ہیں؟

کیمپس میں اپنے ساتھیوں اور پھر دوستوں کے ساتھ کام کرتے ہوئے، ہمیں خیال آیا کہ ہم ان سلگتے سوالات کے جواب کے لیے آج کے دور کی ممتاز شخصیات سے رجوع کریں، ہم چاہتے تھے کہ نہ صرف دیگر سکالروں، بلکہ دنیا کے مختلف شعبوں، تہذیبوں، مذاہب اور فرقوں سے وابستہ عوامی شخصیات سے رابطہ کر کے وسیع النظر ریسرچ کی حامل آراء حاصل کی جائیں تاکہ 11 ستمبر 2001ء کے بعد کے واقعات کے حوالے سے دانشوروں کے ذہن میں رونما ہونے والے خیالات سے آگاہی حاصل کریں۔ والدین اور دادا کی حیثیت سے ہم عالمی اداروں کے پھیلاؤ کا راستہ تلاش کرنا چاہتے تھے۔ آئندہ ابواب میں ہم نے وہ خیالات پیش کیے ہیں جن کی اس تناظر میں پرورش ہوئی

ہم نے تجزیہ نگاروں [1] سے درخواست کی کہ وہ اپنے بیش قیمت اور مختلف النوع تجربات کے ذریعے تہذیبوں اور معاشرے کے مختلف طبقات کے درمیان رابطوں کی راہ ہموار کریں تاکہ ہم تہذیبوں کو ایک با پھر مکالمے کی طرف لاکر مفاہمانہ سوچ پیدا کریں۔ وہ سوچ جو گزشتہ کئی صدیوں سے ہمارے معاشرے کا خاصہ رہی ہے اور یہی ہمارے متحرک مستقبل کی ضمانت ہوسکتی ہے۔ ان ممتاز شخصیات کی طرف سے ہمارے پراجیکٹ میں حصہ لینے پر آمادگی سے ہمیں بے انتہا مسرت ہوئی۔ کتاب میں مضامین اس ترتیب سے شامل کیے گئے ہیں کہ اس سے تنازعے کی نوعیت اور ماخذ اور اس کے متبادل حل کا راستہ ہموار ہوتا ہے۔ اس طرح یہ خیال سامنے آتا ہے کہ ہم مستقبل کے ابہام کے سامنے خاموش تماشائی کے طور پر کھڑے نہیں رہیں گے۔

مضامین میں اٹھائے گئے مرکزی خیالات

ضروری نہیں کہ ان مضمون نگاروں کا ہر معاملے سے براہ راست تعلق ہو بلکہ انہوں نے ان نکات پر روشنی ڈالی ہے جو اہم یا پھر غیر اہم ہیں۔ البتہ یہ سب ایک نکتے پر متفق ہیں اور وہ تہذیبوں کے درمیان ممکنہ تصادم کا راستہ روکنے کے لیے قابل عمل حل نکالنا ہے۔ ان مضامین میں معاشرے کو درپیش مسائل کی نوعیت جاننے اور ان کا حل نکالنے کی سمت میں پیشرفت کی گئی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی مصنف پروفیسر سیموئیل پی ہنٹگٹن کے تہذیبوں کے تصادم کے اس نظریئے [2] سے متفق نہیں کہ کسی ثقافت کی شناخت کے لیے دشمنوں کو پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے بلکہ اکثر مضمون نگاروں کا خیال ہے کہ دنیا بھر میں پائے جانے والے مختلف رجحانات بنیادی اقدار اور مفادات سے منسلک ہیں۔

درپیش تنازعات کی وجوہات کا تدارک:

تمام مضمون نگار ان قدامات کو نہایت اہمیت کا حامل خیال کرتے ہیں جو کشیدگی، تنازعے، رجائیت پسندی، عدم رواداری غربت، امتیازی سلوک، جہالت، مطلق العنان یا شاہانہ حکمرانوں، گلوبل ازم اور عالمی سطح پر تنہائی کے مسائل کا توڑ ہیں، یہ اقدامات ان پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں جو مذہب کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا باعث بنتے ہیں۔

تصادم اور معاشرتی تنہائیAlienation کی جس وجہ پر ہر مضمون نگار کا اتفاق ہے وہ عدم برداشت اور نفرت ہے۔راجموہن گاندھی کے نزدیک عدم رواداری ان کے بچپن کا ذاتی مشاہدہ ہے۔ جوانہوں نے بھارتی معاشرے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین منافرت کی صورت میں دیکھا۔ اس کے بعد انہوں نے مشرق وسطیٰ' افریقہ اور دنیا کے دیگر کئی ملکوں میں بار بار اس کے مظاہرے دیکھے۔ ملکہ نور بھی مختلف تہذیبوں سے اچھی طرح آشنا ہیں اور انہوں نے ہر کلچر میں عدم رواداری کے اثرات کا مشاہدہ کیا۔ بعض اوقات تو انہیں یہ معاشرتی خرابی عملی صورت میں نظر آتی ہے وہ کہتی ہیں کہ اکثر اوقات یہ کیفیت طاقت کے استعمال کی شکل میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اس طرح خوف' عدم برداشت اور تشدد کا ایک چکرCycle جنم لے لیتا ہے۔ ڈیانا ایک مختلف عقائد یعنی اسلام' ہندومت' سکھ مت' عیسائیت اور یہودیت سے تعلق رکھنے والی خواتین کے مابین مکالمے کے دوران سامنے آنے والے اس المناک عنصر کی نشاندہی کرتی ہیں۔

آنجہانی سرجیو وائرا ڈی میلو کے نزدیک عدم رواداری بالخصوص ایک سربستہ عنصر ہے جو اکثر اوقات بددیانتی اور غلط بیانی کے پیچھے چھپا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ انسانی حقوق کے تحفظ اور رواداری کے فروغ کے لیے ضروری ڈھانچے کی نشوونما میں قانون کی حکمرانی کا سب سے اہم کردار ہوتا ہے۔ وہ قرار دیتے تھے کہ رواداری کے عنصر کی ترویج کا آغاز خواتین سے کیا جانا چاہیے۔ جو امن کے لیے ایک طاقت کی حیثیت رکھتی ہیں اور خاندان اور کمیونٹی کو جوڑنے کی صلاحیت کی حامل ہوتی ہیں۔

کئی دیگر مضمون نگار عدم رواداری کی وجوہات پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ ربی جوناتھن ساکس سمجھتے ہیں کہ معاشرتی عدم برداشت میں زیادہ ہاتھ مذہب کا ہوتا ہے اور یہ کہ عدم برداشت کے بیج بنیاد پرستی کے لحاظ سے زیادہ تر اخراج' خوف اور لاتعلقی 3میں بوئے جاتے ہیں۔ جوڈیا پرل کا موقف استثنائی وضاحت کے منفرد پہلو کا حامل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ بیماری ایک لاعلاج تصادم کی حامل ہے۔ حتیٰ کہ معاشرے میں فعال افراد کو ان عناصر سے لاتعلقی اختیار کر لینی چاہیے جو مختلف عقائد اور ثقافتوں میں عدم رواداری کی وکالت کرتے ہیں اور انسان کی بقاء کے لیے خطرہ ہیں اور مہذب معاشرے کی بنیادی اقدار کی نفی کرتے ہیں۔ دوسری طرف ششی تھرور کا خیال ہے کہ عدم رواداری کا مسئلہ سنسر شپ سے حل نہیں کیا جا سکتا۔ میڈیا جہاں خوف اور عدم برداشت کی ترویج کا

باعث بنتا ہے وہاں رواداری کے فروغ کے لیے اس کی صلاحیتوں سے مفر ممکن نہیں۔ گویا میڈیا انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے باب میں پیشگی خبردار کرنے کا سسٹم بھی ہے۔کوفی عنان کہتے ہیں غربت اور جہالت عدم برداشت کی بنیادی وجہ ہیں۔ اصل چیلنج اس بگاڑ کا قانونی حل یعنی تعلیم، اقتصادی وسماجی ترقی ہیں اور یہ عمل عدم برداشت کے خلاف محاذ جنگ کھولنے سے پہلے ہونا انتہائی ضروری ہے۔ زبیگنیو برزیزنسکی کے نزدیک آج معاشرے میں جوعدم رواداری پائی جاتی ہے اس کی جڑ طاقت کا عدم توازن ہے۔ اس کی بڑی وجہ امریکہ کی خارجہ پالیسی ہے جو عالمی منظرنامے کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں۔ یہ پالیسی زہرآلود اور جارحانہ پہلوؤں کی حامل ہے۔ جوڈی ولیمز سمجھتے ہیں کہ ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' نے دشمنیوں کو ہوا دی ہے اور عالمی سیکیورٹی کے تحفظ کے نام پر دنیا کو الٹا غیر محفوظ بنا دیا گیا ہے جبکہ والٹر آئزک سن عدم برداشت کی وبا پر قابو پانے کے لیے اخلاقی قدروں کی ترویج کے قائل ہیں۔ وہ اس ضمن میں بنجمن فرینکلن کی طرف سے مذہبی عدم رواداری کا برداشت او رمذہبی اجتماعیت کے ذریعے حل نکالنے کی مثال دیتے ہیں۔ سابق امریکی صدر نے اس مسئلے کو نرمی وسختی دونوں طرح سے ختم کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔

کئی مضمون نگاروں کا یقین واثق ہے کہ کشیدگی اور تصادم کے پس پردہ برے عوامل غربت اور معاشرتی تنہائی ہیں۔ سرجیو وائراڈی میلو مساوات اور احترام کو بنیادی کائناتی اقدار قرار دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ دنیا ان دونوں قدروں کے حوالے سے غفلت کا شکار ہے۔ اس وقت دنیا میں ڈیڑھ ارب افراد انتہائی غربت کی زندگی بسر کررہے ہیں۔ جیمز دی وولفن سوہن لکھتے ہیں کہ دنیا کی بیشتر آبادی ترقی پذیر ملکوں میں رہتی ہے۔ ان گنت تعداد میں لوگوں کی بسلسلہ روزگار نقل مکانی سے خاندانوں کو سنگین مسائل کا سامنا ہے۔ ششی تھرور کا مشاہدہ ہے کہ ایسے دور میں جب دنیا مواصلات اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کی بلندیوں کی طرف گامزن ہے غربت کی صورتحال مزید بگڑ گئی ہے۔ چھوٹے سے یورپی ملک لکسمبرگ کے 4 لاکھ شہریوں کو براعظم افریقہ کی 7 کروڑ 60 لاکھ آبادی سے زیادہ انٹرنیٹ کی جدید سہولتوں تک رسائی حاصل ہے۔ دنیا میں غریبوں کی اتنی بڑی تعداد کبھی نہیں رہی اور مواصلات کی جدید سہولتوں تک عدم رسائی کے علاوہ ان غریبوں کی حالت زار امارت کی بلندیوں کے سامنے کبھی اتنی واضح نہیں رہی۔ان لوگوں کا دولت اور روزگار کے مواقع تک پہنچنا بظاہر ناممکن نظر آتا ہے۔

مذہب کا کردار:

کیا تہذیبوں کا تصادم مذہب کی پیداوار ہے؟ ایڈورڈ او ولسن کا موقف ہے کہ بڑی حد تک ایسا ہی ہے المناک تنازعات سے واضح ہوتا ہے کہ مذہبی نظریات اب زیادہ موثر رہنما باقی نہیں رہے۔ اگرچہ مذہب نے ثقافتوں کو سجائیت' خدمت عامہ اورفنون لطیفہ کی ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا تاہم اس نے ایسی قبائلی دیو مالاؤں جو ہمیشہ سے قائم اور خطرناک تقسیم کا موجب ہیں کی بھی توثیق کی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کی مقدس تعلیمات کو مشرقی وسطٰی میں مسیحی پہلو سے بیان کیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک صاحبان بصیرت کی سائنسی روشن تصویر مذہبی تعلیمات کے زیادہ شفاف ادراک کی بنیاد سمجھی جا رہی ہے۔ اس طرح ثقافتی اختلافات کے خاتمے سے انسانیت کے اتحاد کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ اگر مذہب نے انسان کو قدیم دور میں ڈارونی (Darwinian) رخ دیا تھا تو آج عقلی استدلال اور ٹھوس علم کی بنیاد بھی اس رخ پر رکھنی چاہیے۔ اس کتاب کے کئی مصنفین نے مذہب کے کئی روشن اور واضح پہلو سامنے لائے ہیں۔ جوڈیا پرل کہتے ہیں کہ قدیم عہدنامے ہمارے لیے کسی حد تک عقل و دانش کا ذریعہ تو ہیں لیکن یہ اخلاقی رویے کا مکمل نتیجہ نہیں۔ بشپ ڈیسمنڈ توتو کا مشاہدہ یہ کہتا ہے کہ مذہب ولی اور خودسر دونوں قسم کے انسان بنا سکتا ہے۔ جب انسان دوست ہو تو مذہب کی حیثیت صحت مندانہ ہوتی ہے لیکن کفر اور دشمنیوں کی تلاش شروع کر دی جاتی ہے تو پھر مذہب کا پہلو بھیانک ہو جاتا ہے۔ اگرچہ تمام بڑے مذاہب خودسر افراد پیدا کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہر مذہب ایمانداری' اخلاقی اقدار' رحمدلی' انسانیت کے اتحاد اور امن کے سنہری اصولوں پر زور دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا نقطہ ہے جو پرائم ٹیلی ویژن کے ''ریڈیکل فنڈ مینٹالسٹس'' کے موضوع پر ڈراموں میں نہیں ملے گا۔ کوفی عنان نے ہمیں برخود غلط افراد کو سمجھنے میں مدد کی اور بتایا کہ کس طرح مذہب کو سیاسی اور علاقائی تنازعات میں ملوث کیا گیا۔ ربی ساکس کے نزدیک مذاہب سرحد پار تصادم پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن مذہب وہ چیز ہے جو انسانوں کو ابتدائی سطح پر اکٹھا اور خدا سے وابستہ رکھنے کا باعث بنتا ہے۔ یہ مذہب ہی ہے جو لوگوں کو شناخت اور اخلاقی درس دیتا ہے' امن اور بھائی چارے کا سبق دیتا ہے۔ جیمز وولفن سوہن کے نزدیک مذہبی بنیادوں پر استوار تنظیمیں بھی دنیا سے غربت اور اس کے دیگر مسائل کے خاتمے کے لیے انتہائی موثر حیثیت رکھتی ہیں۔ شہزادہ حسن بن طلال سمجھتے ہیں کہ تنازعات سے ابلتے برتن یعنی کرہ ارض کو امن کی جگہ بنانے کے امکانات

اس وقت زیادہ روشن ہو جاتے ہیں جب ہر مذہب انسانیت کی آزادی کو تسلیم کرتا ہے؟ اجتماعیت کا حامی ہوتا ہے۔ اخلاقیات کی توثیق کرتا ہے اور مشترکہ انسانیت کے حوالے سے خوشی مناتا ہے۔

مکالمے کی توسیع:

1998ء میں اقوام متحدہ سے خطاب میں ایرانی صدر محمد خاتمی نے تہذیبوں کے مابین مکالمے کی تجویز دی۔ 2 سال بعد اسی پلیٹ فارم پر انہوں نے مذہبی وثقافتی عناصر کی بنیاد پر قائم اپنے خیال کی مزید تشریح کی۔ انہوں نے کہا کہ فارسی (ایرانی) نظریئے اور ثقافت نے سیاسی طوفانوں اور خوشگوار ہواؤں کے دوراہے پر جنم لیا اور بین الاقوامی تجارت کا راستہ بھی یہیں سے گزرتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اسلام انسانی مساوات کو زندگی اور موت کا مسئلہ سمجھتا ہے اور جب اسلامی تعلیمات دنیا کے مختلف حصوں تک پہنچیں تو مختلف ردعمل سے کثیرالجہتی کا خوبصورت امتزاج نظر آیا۔ اس کتاب کے مضمون نگار اس روح کی توثیق کرتے ہوئے بار بار کہتے ہیں کہ عالمی تنازعات کا حل بین العقائد مکالمے میں مضمر ہے۔ 4 برنارڈ لیوس ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ مکالمہ اتنا ہی قدیم ہے جتنی کہ ہماری تاریخ پرانی ہے' مکالمے میں امید ہے جبکہ تصادم میں حملے اور جوابی حملوں کا پہلو سامنے آتا ہے۔ سابق آرچ بشپ لارڈ کیری لکھتے ہیں کہ معاشرے میں پائے جانیوالے مہلک مسائل کا تعلق اسلام اور مغرب سے ہے؟ لہٰذا اس حوالے سے مکالمے کو ان مسائل کا تدارک کرنا ہوگا اور یہ عمل انتہائی ایمانداری اور ذمہ داری سے ہونا چاہیے۔ کوفی عنان سمجھتے ہیں کہ مکالمہ دراصل عدم برداشت اور تنازعے کا توڑ ہے اور مذہب کو سیاسی گریز بنا کر مفاہمت' تعاون اور انسانی حقوق میں توسیع کا راستہ کھولا جا سکتا ہے لیکن مذہب کو اشتعال انگیز لہجے اور جارحانہ اقدامات کے طور پر استعمال کر کے کچھ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اسی اثناء میں صدر خاتمی کہتے ہیں کہ مکالمہ اس وقت وقوع پذیر ہوسکتا ہے جب دوسرا فریق آپ کی بات پر کان دھر رہا ہو۔ مکالمے کا عمل مشترکہ معاملات اور اختلافات پر بحث سے عبارت ہوتا ہے۔ مریلین سٹراتھن کا مضمون اس حوالے سے پرمغز تفصیلات کا حامل ہے۔ ایک شخص مشترکہ نظریات کے حامل گروہ کے درمیان اختلافات کی اخلاقی ذمہ داری مخالف نظریات والے گروپ کے اختلافات کے حل کی ذمہ داری کے ساتھ کیسے ادا کر سکتا ہے؟ جیسا کہ ان کے مضمون کا عنوان ظاہر کرتا ہے مسئلے کا حل خدمت کے قدیم جذبے میں مضمر ہے۔ موسیقار روی شنکر کا موقف ہے کہ کوئی مکالمہ محض اس وقت موثر ہوگا جب آپ دوسرے فریق کی تان بہتر کرنے سے پہلے اپنی تان سریلی کریں گے۔ مکالمے کے اثرات دوچند ہو سکتے ہیں۔ اگر کسی کو نقصان پہنچانے

کے خیال سے پاک ہو اور روحانیت پر مبنی ہو' ممتاز موسیقاروں جیسا کہ بیٹلز Beatles کے جارج ہیری سن اور وائلن نواز لارڈ یہودی مینوہن کے ساتھ موسیقی کے مکالمے کا حوالہ دیتے ہوئے روی شنکر کوفی عنان کے اس موقف کے حامی ہیں کہ تنوع مکالمے کو پر اثر بنا دیتا ہے۔

ایمیٹائی زیونی بیان کرتے ہیں کہ اگر بہتری کے لیے عوامی پالیسی کی تشکیل کے نقطہ نظر سے کثیر القومی مکالمہ ہو تو اس کی بنیاد میڈیسن ایونیو کے آلات کے استعمال کے ذریعے رائے عامہ ہموار کرنے پر استوار نہیں ہو سکتی۔ دیگر مصنفین اس موقف کی تائید کرتے ہیں۔ ملکہ نور احترام پر زور دیتے ہوئے کہتی ہیں کہ دوسرے فریق کا احترام کیے بغیر بات چیت کا عمل آگے نہیں بڑھ سکتا۔ تمارا سون اپنی تحریر میں جوڈیا پرل اور اکبر احمد کے درمیان احترام پر مبنی مکالموں کے سلسلے کا لطیف پیرائے میں حوالہ دیتی ہیں اور کہتی ہیں کہ مکالمے کے ذریعے پر تشدد کارروائیوں سے پیدا ہونے والے مسائل کے حل کے لیے فوری نتائج حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ تاہم اس عمل سے خیر سگالی کا وہ طاقتور جذبہ ضرور جنم لے سکتا ہے جو قیام امن کے لیے ضروری ہوتا ہے' ربی ساکس ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ ہمیں اپنے مقصد کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہیے۔ مکالمے میں وہی ہیرو ہوگا جو اپنے دشمن کو دوست بنا لیتا ہے اس قسم کا نتیجہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ معاف کرنے کی اخلاقی جرات پیدا کی جائے۔

کچھ رہنما کہتے ہیں کہ تصادم کے دوران بھی مکالمے کو ایک ضروری اقدام کے طور پر استعمال کرنا چاہیے۔ اس طرح تنازعے کا خاتمہ ممکن ہو سکتا ہے۔ جین بیتھک ایلشٹائن سمجھتے ہیں کہ تہذیبوں کے مابین طاقتور مکالمہ ایک فریق کے اپنے مقاصد اور اقدام پر عکس ڈالنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جا سکے کہ طاقت کا استعمال جائز ہوتا ہے؟ وہ کہتی ہیں کہ جب جنگ میں اس عکس پر عمل کیا جاتا ہے تو محض جنگ کے اصول میں مکالمے کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔ یوں باہمی مفاہمت اور امن کے امکانات کو تقویت ملتی ہے۔

آج کے دور میں اس لحاظ سے بھی مکالمے اور مثبت ثقافتی تبادلے کی ضرورت بڑھ گئی ہے کیونکہ مغرب اسامہ بن لادن کے بارے میں تو بہت کچھ جاننے کا خواہاں ہے لیکن اسے مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں معلومات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اسی طرح مسلمانوں نے مغربی باشندوں بالخصوص امریکیوں کے بارے میں غلط خیالات قائم کر رکھے ہیں؟ اس قسم کے تصورات کی تصدیق مغرب اور اسلامی دنیا میں کیے گئے کئی سروے سے ہوتی ہے۔

گورننس کی اصلاح:

ایک اور بڑا تصور یہ ہے کہ معاشرے میں غیر معیاری گورننس عام ہے اور اس میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ سرجیوڈی میلوقرار دیتے ہیں کہ دنیا میں اگرچہ پہلے کی بہ نسبت زیادہ جمہوریت پائی جاتی ہے لیکن جمہوریت توسیع پسندی اور بربریت روکنے کے عمل کی ضمانت نہیں دیتی۔ جہاں کہیں حکومتیں انسانی حقوق کی ترویج میں مؤثر ثابت نہیں ہوتیں وہاں نچلی سطح پر کارپوریٹ شہریت کے اصول کے تحت کام ہونا چاہیئے۔ آئزک سن سمجھتے ہیں مؤثر گورننس کی اہم کنجی سمجھوتے Compromise میں مضمر ہے۔ اس طرح جمہوریت کے قیام کا عمل نہایت اہم ہوسکتا ہے۔ بنجمن باربر کہتے ہیں کہ حکومتوں کو عالمی باہمی انحصار کے معاملے میں لازماً حساس ہونا چاہیئے۔ اگر حکومتیں ایسا نہ کریں تو پھر شہریوں کو آگے بڑھ کر یہ فریضہ انجام دینا چاہیئے۔ غیر سرکاری تنظیموں کو عالمی سطح پر رابطوں سے منسلک ہونا چاہیئے۔ جوزف ایس نائے زور دیتے ہیں کہ زبان و طاقت کے استعمال کی روایتی پالیسی کو نرم پالیسی کے مثالی اقدام میں تبدیل کیا جانا چاہئے۔ اس کی بنیاد دوسرے فریق کو سننے پر ہونی چاہیے اور باہمی احترام اور قانونی پہلوؤں کا خیال رکھنا ضروری ہوگا۔

غربت، جہالت، خوف اور تصادم کے دیگر مآخذ سے نمٹنے کے ان پہلوؤں، مکالمے کی تکنیک کی توسیع وترقی، حکومت کی اصلاحات، شہریوں کی شمولیت کے فروغ اور دیگر عوامل کو وسیع مناظر میں لیا جانا چاہیئے اور یہی مفید ثابت ہوں گے اور یہ فہرست کوئی زیادہ پریشان کن نہیں۔ ہمیں ابھی مزید وجوہات کا پتہ چلانا ہوگا اور ان کے تدارک کے اقدامات اختیار کرنا ہوں گے۔ ابھی تک ایسے کئی حل ہیں جو پردہ اسرار میں ہیں۔ ہمیں ان کو تلاش کرنا ہوگا اور ہمیں اس کام کے لئے زیادہ تخلیقی اور ثابت قدم ہونا چاہیئے۔

مزید پیش رفت کے لئے کئی دیگر راستے بالکل واضح ہیں۔ بشمول آئینی جمہوری اقدامات کے، جن میں قانون کی حکمرانی اور بنیادی حقوق پر زور دیا گیا ہو۔ اس طرح ان اقدامات کو تقویت ملے گی، جن سے تہذیب کے علمبرداروں کی آواز مضبوط ہوگی۔ حکومتوں کے ایسے انفراسٹرکچر کی مدد کرنے سے تعلیمی پروگرام، خواتین کے لئے مساوی حقوق، اعتماد سازی کے لئے سوشل نیٹ ورک کی تشکیل ونفاذ، ایسی فلموں کی برآمد پر پابندی جن سے تشدد کو گلیمرائز کیا گیا ہو۔ بین الثقافت اشتراک

کار کی حوصلہ افزائی، مکالمے پر تحقیق، مفاہمت، رواداری، احترام، تعاون اور شاید سب سے بڑھ کر ان اقدامات کو بامعنی انداز میں شروع کرنے سے روایات و اداروں کے احترام کی حوصلہ افزائی ہوگی۔

عمل کی اہمیت:

مضمون نگار اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ چیلنج بہت بڑے اور متعدد ہیں، لیکن تصادم کو برداشت کرنے کا عمل مزید قابل قبول نہیں ہے۔ ولیم یوری ہمیں دعوت دیتے ہیں کہ ہم سستی کو ترک کر کے ثالثی کے جال (ویب) میں شراکت کار بن جائیں۔ ملکہ نور کہتی ہیں کہ اعتدال پسند طبقہ عدم برداشت اور خوف کے شعلوں کو لگام دینے کے معاملے میں زیادہ تحمل کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ جوڈی ولیمز شاعر Roethice کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمیں ناممکنات میں تخصص کرنا چاہیئے۔ مارٹن مارٹی نے ابراہم لنکن کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ ہمیں خلوت کے لئے بہتر فرشتوں کی ضرورت ہے، ہمیں رواداری کو آزما کر عدم رواداری کا مقابلہ کرنا ہے اور اس کے لئے ہمیں کچھ رسک بھی لینا پڑیں گے۔

آنے والے صفحات میں شامل مضامین مکالمے اور باہمی مفاہمت کی طاقت سے عبارت ہیں جن میں برداشت، احترام، تعاون اور عزم کا درس دیا گیا ہے۔ معاشرے کے مختلف طبقات میں اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے مضمون نگاروں نے مثبت روابط کی عظمت پر روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے ایک ایسی دنیا کی تصویر پیش کی ہے، جس میں لوگ مختلف تہذیبوں کے باوجود مشترکہ جذبات اور مفادات رکھتے ہوں۔ سکالر ہونے کے ساتھ ساتھ ہم خود کو طالب علم بھی سمجھتے ہیں اور ان مضمون نگاروں نے ہماری میز پر سوچنے کے لئے کئی خیالات کا انبار لگا دیا ہے۔ انہوں نے ہمیں انسانیت کی بقاء پر غور کے لئے کئی عناصر فراہم کئے ہیں۔ سب سے اوپر ہماری یہ امید ہے کہ یہ مضامین پرکھنے والے کے لئے سحر انگیز مواد ثابت ہوں گے۔ اگر ہمارا قاری ان مضامین سے مثبت سوچ حاصل کرتا ہے تو ہم اسے اپنی کامیابی سمجھیں گے، اس طرح معاشرے پر چھائی دھندلاہٹ کے خاتمے کے لئے یہ اجتماعی آگاہی کے مترادف ہوگا۔

حوالہ جات

1- اگرچہ ان مضامین کے لئے مواد مضمون نگاروں سے براہ راست حاصل کیا گیا ہے، صرف سرجیوڈی میلوجن کو عراق میں قتل کر دیا گیا تھا کہ مضمون کا مواد ہم نے اقوام متحدہ کی اجازت سے حاصل کیا ہے۔

2- دی کلیش آف سویلائزیشن اینڈ دی ری میکنگ آف ورلڈ آرڈر/ ہننگٹن۔

3- ربی ساکس کی کتاب دی ڈگنٹی آف ڈیفرنس ملاحظہ کیجئے۔

4- ہم میں سے ایک نے لکھا ہے کہ کہ مکالمہ تنازعے سے زیادہ طاقتور عنصر ہے۔ تہذیبوں کے اندر اور مابین مکالمے متوازن اور اہم ہیں۔ (اکبر محمد۔ اسلام انڈر سیج)

حصہ دوم

مسئلے کی نوعیت اور وجوہات

باب2

کمزوری کی سادہ طاقت' طاقت کا پیچیدہ خطرہ

زبیگنیو برزیزنسکی

معاشرے میں مکمل تحفظ کا تصور اب ایک دیومالائی حیثیت اختیار کر چکا ہے' گلوبلائزیشن کے دور میں مکمل تحفظ اور دفاع ممکن نہیں ہے' اصل ایشو یہ ہے: مسلسل مربوط اور بین الانحصار دنیا میں ہم اپنے مفادات کا تحفظ کرتے ہوئے کتنے عدم تحفظ کے ساتھ رہ سکتے ہیں؟ بے کراں عدم تحفظ کئی صدیوں تک کئی اقوام کی قسمت بنا رہا' جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے یہاں یہ اب کوئی چوائس نہیں رہی' اگرچہ سماجی طور پر اس سے عدم اتفاق کیا جاتا ہے تاہم امریکہ کا عدم تحفظ سیاسی طور پر قابل حل ہے......لیکن اس کے لیے اس خطرے کا واضح اور مفصل تعین ضروری ہے جو امریکہ کو درپیش ہے۔

یہ بات تسلیم کرتے ہوئے کہ امریکہ ایک جمہوریت ہے' عوام کو خطرے کی تعریف Definition کو با آسانی سمجھنا ہوگا تاکہ وہ ان قربانیوں کے لیے آمادہ ہوسکیں جو خطرے سے نمٹنے کے لیے ضروری ہوتی ہیں' یوں مخصوصیت اور شفافیت کی قیمت لگتی ہے لیکن اس سے اشتعال انگیزی کے عنصر کی بھی تخلیق ہوسکتی ہے' اگر خطرے کی تشبیہ یا شناخت بدی کے طور پر کی جائے' حتیٰ کہ یہ گھسے پٹے انداز میں نظر آتا ہو تو طویل المدت حل کے لیے سماجی تحریک آسان ہوجاتی ہے' انسانی بالخصوص بین الاقوامی امور میں نفرت و جارحیت' ہمدردی اور حسن سلوک سے کہیں طاقتور جذباتی قوتیں ہیں' قوموں کے اقدامات پر اثر انداز ہونے اور حقیقی روابط کے ناگزیر' پیچیدہ اور سیاسی محرکات یہاں تک دہشت گرد گروپوں کی کارروائیوں کے تناظر میں ان جذبات کا اظہار آسان ہوتا ہے۔ لیکن نقصانات کے حوالے سے ان جذبات کا ابھار خطرے کو عوامی سطح پر سمجھنے اور اس پر قابو پانے میں مضمر ہوتا ہے۔

اشتعال انگیزی کے خطرات

11 ستمبر 2001ء کے واقعات کے بعد امریکہ میں عوامی ردعمل اس مسئلے کو نمایاں کرتا ہے' عوامی لیڈروں کی تقریروں اور اخباری اداریوں میں نظر آنے والا عوامی ردعمل ابتدائی طور پر دہشت گردی پر توجہ مرکوز کرنے پر توجہ دیتا ہے'اس کے ساتھ ساتھ دہشت گردی کے برے پہلو اور اسامہ بن لادن پر توجہ دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ صدر بش نے اس مسئلے سے تقریباً مذہبی نقطۂ نظر سے نمٹنے کا اعلان کیا اور اسے نیکی اور بدی میں تصادم قرار دیا۔ بلکہ انہوں نے لینن کے نظریے کو اختیار کیا کہ ''جو ہمارے ساتھ نہیں دراصل ہمارا مخالف ہے۔'' اس تصور کو عوامی موڈ سے تو ہم آہنگی ہوسکتی ہے لیکن اس سے ان پہلوؤں کی نفی ہوتی ہے جو اکثر عالمی الجھنوں کے حل کا باعث بنتے ہیں۔

صدر بش کے اس مُلائی تصور سے بمعہ اس کے سیاسی تحریک کے اثرات کے' تنازعے کے مآخذ کے خطرات کو ایک سادہ سے فارمولے کے تحت متحد ہونے کا موقع مل گیا' قطع نظر اس بات کے کہ پہلے ایسی قوتیں باہم منسلک تھیں یا نہیں' صدر بش نے 2002ء میں مشہور فقرہ ''بدی کے محور'' پیش کیا' جس سے شمالی کوریا سے شمال مشرقی ایشیا کو لاحق خطرے' خلیج میں ایران کے وسیع النظر عزائم اور صدام حسین کی نامکمل وراثت کے خلاف مہم تک احاطہ ہوتا تھا' اس طرح ایٹمی ہتھیاروں کے حصول کی دوڑ میں لگی ان قوتوں کو ایک کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا جو ایک دوسرے کے قریب نہیں تھیں بلکہ ان میں دو تو ایک دوسرے کی بدترین دشمن تھیں اور ان کو امریکی عوام کے خلاف دردناک دہشت گردی کے تجربے سے براہ راست جوڑ دیا گیا۔

امریکیوں کے نزدیک ''بدی کا محور'' دراصل خطرے کی سخت تعریف تھی' اس سے دورخی مسئلے نے سر اٹھایا۔ اول یہ کہ اب امریکی سکیورٹی کو عالمی سکیورٹی سے منسلک کیا گیا اس طرح دہشت گردی کے خلاف مہم میں عالمی تعاون درکار تھا' یہ بات اہم ہے کہ امریکہ سے باہر طبقوں کی طرف سے اس تعریف کی حمایت ضروری تھی' لیکن کیا وہ ایسا کریں گے؟ دوم کیا یہ تعریف اپنی ہیئت کے اعتبار سے کافی ہے؟ اور کیا یہ وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں اور دہشت گردی سے لاحق خطرات کے جواب کی طویل المدت بنیاد فراہم کرتی ہے؟

مشکل یہ ہے کہ امریکیوں کو دہشت گردی کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے آمادہ کرنے کی

(بش) انتظامیہ کی تعریف فیشن زدہ انداز میں واضح کی گئی ہے' صدر (بش) کی طرف سے ابھی تک یہ واضح نہیں کیا گیا کہ دہشت گردوں سے نامعلوم ''شرپسندوں'' جن کے عزائم مبینہ طور پر شیطانی ہیں کی تعداد میں کتنی کمی آئی ہے؟ دہشت گردی کو دشمن کے طور پر سامنے لانے سے اس حقیقت کو بخوشی جھٹلایا گیا ہے کہ دہشت گردی افراد' گروپوں یا ریاستوں کی طرف سے اختیار کی گئی ایک مہلک تکنیک ہے اور کوئی بھی کسی تکنیک کے خلاف جنگ نہیں چھیڑ سکتا۔ مثال کے طور پر کوئی اس مؤقف پر دوسری جنگ عظیم شروع نہیں کرسکتا تھا کہ جنگ اچانک حملہ کرنے والے جرمنوں کے خلاف لڑی جارہی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ دہشت گردی ایک پیچیدہ مظہر ہے......اس کی جڑیں اتنی ہی زیادہ ہیں جتنی اس سے نمٹنے کے لیے طریقے درکار ہیں۔ لسانی' قومیتی یا مذہبی مایوسی سے منسلک دہشت گردی سب سے زیادہ طویل ہے لیکن اس کے خاتمے کی کوششیں بہت کم کی گئی ہیں' زیادہ آسان الفاظ میں کہتا ہوں کہ دہشت گردی سماجی محرومیوں سے جنم لیتی ہے' حتیٰ کہ بنیاد پرست مارکس ازم جیسے نظریات بھی دہشت گردی کی وجوہات سے نمٹنے کے سوال پر ناکام نظر آتے ہیں' سماجی طور پر الگ تھلگ کرنے سے بعض دہشت گردوں کے حوصلے پست ہوئے ہیں اور کچھ دیگر کو پکڑ لیا گیا' دہشت گردی کی بالخصوص بنیاد جغرافیائی طور پر الگ تھلگ کلاس' جیسا کہ دہقان ہیں' پر استوار ہے (چین اور لاطینی امریکہ کی مثالیں دیکھ لیں) اور اگر اس تحریک کو چھاپہ ماروں کی حمایت مل جائے تو مشکلات مزید بڑھ جاتی ہیں لیکن تاریخی دیو مالا کی حامل مشترکہ لسانیت میں پرورش پانے اور مذہبی طور پر اس میں تیزی سے یہ تمام دیگر اقسام کی بہ نسبت زیادہ مزاحم ثابت ہوتی ہے۔

بلاشبہ دہشت گرد بذات خود مایوسی کا شکار ہیں لیکن جو حالات ان کے حوصلے بڑھاتے ہیں شاید مایوس کن نہیں' یہ ایک اہم انفرادیت ہے۔ دہشت گرد اپنی طرز کی دنیا میں رہتے ہیں اور خود ساختہ نیکوکاری کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں' صرف تشدد نہیں بلکہ اس کی وجوہات کا خاتمہ بھی ازحد ضروری ہے۔ یہ بات یقینی بنانے کہ دہشت گردوں کی صفوں میں تازہ اضافہ نہیں ہو رہا کے لیے ایک محتاط سیاسی حکمت عملی کی ضرورت ہے تاکہ ان پیچیدہ سیاسی اور ثقافتی قوتوں کو کمزور کیا جاسکے' جو دہشت گردی کو ہوا دیتی ہیں' ان قوتوں کو تقویت دینے والے عناصر کا بھی محاسبہ کرنا ہوگا۔

کمزوری کی طاقت

خطرے کے امتیازی پہلوؤں پر غور کرنا بھی نہایت ضروری ہے' جس کی شاخیں طاقت نہیں کمزوری سے نکلتی ہیں۔ 11 ستمبر کو 19 جنونیوں......جو معمولی اوزاروں سے لیس تھے اور اپنی جان دینے کے خواہاں تھے......نے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر امریکہ کی خارجہ پالیسی کو عسکری رخ دیا۔ وہ روس کی مغرب کو مشرقی رنگ دینے کی کوششوں میں تیزی لائے' جس سے یورپ اور امریکہ میں دوریاں آئیں' امریکہ کے معاشی مسائل میں اضافے کا باعث بنے' اور امریکہ کی انسانی حقوق کی روایتی تعریف کو بدل کر رکھ دیا۔ اس سے پہلے کبھی محض بے دست و پا چند افراد نے ایک بڑی اکثریت کو یوں تکلیف نہیں پہنچائی تھی۔

اسی میں دنیا کی واحد سپر پاور کی الجھن پنہاں ہے کہ ایسے دشمن سے کیسے نمٹا جائے جو جسمانی طور پر تو کمزور ہے لیکن اس کے عزائم انتہائی جنونی ہیں' ان عزائم کے مآخذ کے خاتمے تک دشمن کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوئی کوشش ثمر آور نہیں ہوسکتی۔ نفرت کے اظہار سے اس برائی کو مزید پنپنے کا موقع ملے گا' اس دشمن کا خاتمہ ان کے عزائم اور جذبات کی محتاط شناخت جن کی ابھی تک تشریح نہیں کی جاسکی سے ممکن ہے۔

کمزور جنونی خود کو طاقتور میں تبدیل نہیں کر سکتے لیکن ان میں طاقتور کو انتہائی قابل رحم حالت میں بدلنے کی صلاحیت ضروری ہوتی ہے' کمزوری کی طاقت دراصل سیاسی مساوات ہے جسے عسکری ماہرین درپردہ جنگ قرار دیتے ہیں' دراصل عسکری امور میں انقلاب ......جو کسی طبعی Physical طاقت کی ٹیکنالوجی کے لحاظ سے برتری کو بڑھتا ہے......کو سماجی نقصانات میں اضافے سے گزند پہنچتا ہے' جس سے طاقتور کے اپنے سے کمزور حریف کے خوف میں اضافہ ہوتا ہے۔

کمزور کے برعکس طاقتور ضرورت سے زیادہ سادگی کی عیاشی کا متحمل نہیں ہوسکتا' طاقتور اپنے خوف کو ضرورت سے زیادہ سادہ قرار دینے پر خود کمزور ہوجاتا ہے' کیونکہ طاقتور کے مفادات وسیع البنیاد ہوتے ہیں' ان کے تحفظات باہم منحصر ہوتے ہیں اور کیونکہ ان کے نزدیک بہتر زندگی کی تعریف مقصدی اور معروضی دونوں لحاظ سے وسیع البنیاد ہوتی ہے' طاقتور کو کمزور سے لاحق خطرے کے چیلنج کو نظرانداز کرنا یا یک پہلوی Uni dimensional درجہ ہرگز نہیں دینا چاہیے' ایسا کرنا

چیلنج کے لایعنی پہلوؤں پر توجہ مرکوز کرنے کے مترادف ہوگا۔ ایک کمزور ''بزرگ شیطان'' سے لڑسکتا ہے کیونکہ مرکز نگاہ کی غیر اہمیت اس کی کمزوری کا حل ہوتا ہے' اس کے برعکس طاقتور کو یقینی طور پر دشمن کے ہشت پہلو کردار کو سمجھنا اور اس سے نمٹنا ہوگا۔

غلبے سے قیادت تک

یہی وجہ ہے کہ امریکہ کو عالمی سطح پر ان غیر مرئی الجھنوں کے عملی پہلوؤں کے باعث بدامنی کا سامنا ہے' محض طاقت اور قوت امریکی برتری کے تحفظ کے لیے کافی نہیں' کیونکہ امریکہ کے دشمن پر جوش' اپنی زندگی سے بیگانہ اور امریکہ کے جمہوری اصولوں کو خاطر میں نہ لانے والے ہیں۔ محرومی نئے انتہا پسند ضرور پیدا کرتی ہے اور انہیں جمہوری اقدار پر حملے سے روکنے میں بہت کم کردار ادا کرتی ہے' اگر امریکہ اپنی بقاء اور ملک کے اندر آزادی برقرار رکھنا چاہتا ہے تو اسے بیرون ملک اپنی برتری کو منصفانہ ثابت کرنا پڑے گا۔ اس کا مطلب صرف اتحادیوں سے حقیقی تعاون نہیں بلکہ عالمی سطح پر عصر حاضر کی بدامنی کی پیچیدہ نوعیت کا تدارک کرنا ہوگا۔

اسی طرح امریکہ کو اپنی سکیورٹی کی تعریف کرنا چاہیے کہ جس سے دیگر ملکوں کے مفادات کو متحرک کرنے میں بھی مدد ملے۔ نتیجتاً یہ بات امریکہ کی قومی سلامتی کے مفاد میں ہے کہ مسلمان خود کو ابھرتی دنیا کا حصہ سمجھیں اور اس طرح وہ موجودہ غیر اسلامی ممالک کی طرح خود کو زیادہ ترقی یافتہ اور زیادہ جمہوریت پسند خیال کریں' یہ بات بھی اتنی ہی اہم ہے کہ اسلامی دنیا کے متحرک جمہوری عناصر امریکہ کو اسلامی تہذیب کی نشاۃ ثانیہ میں رکاوٹ نہیں سمجھتے' نہ ہی وہ امریکہ کو مسلمانوں پر غالب کلاس کی حامی خیال کرتے ہیں' یہ مسلمان امریکہ کو ایسا ملک بھی نہیں سمجھتے جو مسلمانوں پر نوآبادیاتی طرز پر غلبے کے حامی ملکوں کا پشتیبان ہے۔

یہ نہایت ضروری ہے کہ اعتدال پسند مسلمان انتہا پسند مسلمانوں کو الگ تھلگ کر دیں' دنیا کے سوا ارب مسلمانوں کی تعمیری شرکت کے بغیر زیادہ پرامن دنیا کا قیام ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے صرف امریکہ کی طرف سے مسلمانوں کے وجود کی اہمیت کو تسلیم کرنا ہوگا اور موجودہ فاصلے ختم کرنا پڑیں گے۔

زیادہ عمومی طور پر یہ کہ امریکی قیادت مزید مؤثر طور پر برقرار رہ سکتی ہے اگر دنیا یہ سمجھ لے کہ

امریکہ کی عظیم سٹریٹجی عالمی برادری کے مفاد میں بھی ہے۔ اس وقت امریکہ کی طاقت اور عالمی سطح پر اس کی ہزیمت دونوں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں' اس طرح بتدریج ایسی (مسلم) کمیونٹی کا احیاء ہوسکتا ہے' یہ انسانی ترقی کی امید سے دنیا کو روشن کر سکتے ہیں۔ دوسری طرح ان کا غلط استعمال اور تصادم دنیا کو بدامنی میں دھکیل دے گا اور امریکہ کو نقصان پہنچے گا صرف اپنی سکیورٹی کے لیے متفکر پریشان حال امریکہ عالمی سطح پر تنہا ہوسکتا ہے اور اسے بین الاقوامی سطح پر نفرت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ آخر میں یہ کہ سادہ سی چوائس کے لیے کون سا منظر نامہ سامنے ہوگا' کیا امریکہ دنیا پر غلبے کا سوچے گا یا اس کی قیادت کرے گا؟



باب3

مکالمے اور دہشت کی گونج: نائن الیون کے بعد مذہبی خواتین کی صدائیں

ڈیانا ایل ایک

’’ایک امریکی اور ایک مسلمان کے طور پر اس صبح میں ٹیلی ویژن پر وہ مناظر دیکھ کر دہشت زدہ ہوگئی، مجھے ایسے لگا کہ اس عمارت سے میرے وجود کے ٹکڑے بکھر بکھر کر گر رہے ہیں۔ اتنے برسوں سے مسلمانوں اور دیگر عقائد کے مابین ہم آہنگی کے لیے کیے گئے اقدامات بالکل بے وقعت نظر آ رہے تھے۔‘‘ شمالی امریکہ کی کونسل برائے مسلم خواتین کی روح رواں شریفہ الخطیب نے 11 ستمبر کے صرف 6 ہفتے بعد ان الفاظ سے مباحثے کا آغاز کیا۔ شریفہ کا یہ خدشہ کہ بین العقائد ہم آہنگی کی کوششوں کو ان حملوں سے سخت نقصان پہنچے گا غلط نہیں تھا، حالیہ 6 ہفتے امریکی مسلمانوں، سکھوں، جنوبی ایشیا اور عرب ممالک کے تارکین وطن کے لیے انتہائی کڑے ثابت ہوئے۔

امریکہ کی مذہبی خاتون رہنماؤں کا قبل ازیں ہارورڈ یونیورسٹی میں اجتماعیت Pluralism پراجیکٹ کے تحت ایک اجتماع ہوا تھا، ہم کیمبرج میں بھی 2001ء میں مسلسل دو دن ملے تھے تا کہ خواتین کی مختلف تنظیموں کے درمیان تعارف ہو سکے اور ان کے کاموں کو باہم مربوط بنایا جا سکے۔ یہ دراصل بظاہر مردوں کے غلبے والی دنیا میں مذہبی خواتین کی قیادت تسلیم کرنے، سیکھنے اور نئی راہیں تلاش کرنے کے عمل کا حصہ تھا، ہم سب مختلف حقیقت کی نمائندگی کر رہی تھیں، یونائیٹڈ میتھاڈسٹ ویمن، ویمن آف ریفارم جوڈازم، دی جیوش آرتھوڈاکس فیمی نسٹ، نارتھ امریکن کونسل فار مسلم ویمن، دی مسلم ویمن لیگ اور دیگر کئی تنظیمیں...... ہماری کیمبرج میں اپریل کی میٹنگ باہمی

تعلقات قائم کرنے کا آغاز تھی لیکن جب ہم 11 ستمبر کے بعد دوبارہ اکٹھی ہوئیں تو ہم سب حیران تھیں کہ کیا ہم وہی بوجھ مزید اٹھانے کے قابل ہوں گی جو پہلے ہم نے اٹھا رکھا تھا؟ پھر جب نومبر کی اس صبح ہمیں معلوم ہوا کہ یہودی خواتین کی بڑی تنظیم حداشہ کی نمائندہ محض اس لیے اجلاس میں شریک نہ ہوئیں کہ وہاں مسلم ویمن لیگ کی بانی صدر بھی موجود تھیں' مختلف نظریات کی حامل نمائندہ رہنماؤں کا ایک میز پر نہ بیٹھنا تعلقات میں دراڑیں پڑنے کا ثبوت تھا' یوں مشرق وسطیٰ میں امریکی پالیسی پر بحث تقریباً جمود کا شکار نظر آنے لگی۔

نومبر تک نائن الیون کی اصطلاح ایک استعارہ بن چکا تھا' جو وسیع تر مفہوم کا حامل تھا۔ ستمبر کی روشن صبح' ٹاوروں کا زمین بوس ہونا' گراؤنڈ زیرو کے مناظر کی دہشت انگیز تصاویر' ہیلمٹ پہنے فائر مین اور ملبے سے بھرے ٹرک' سانحے کے مقام پر گلدستوں اور پیغامات کا ڈھیر' موم بتیاں' صدمے اور بے چینی کی کیفیت' حملے میں ہلاک ہونے والوں کی تصاویر کا روزانہ اخبارات میں شائع ہونا......امریکہ ایک غیر مرئی دشمن پر جوابی حملے کے لیے پرتول رہا تھا' اس طرح ملک کے اندر ہمارے اردگرد موجود نامعلوم افراد کے خلاف کارروائی کی جا رہی تھی' ملکی اور بین الاقوامی سطح پر سزا' جواب اور انتقام کی قدیم حکمت عملی کا ذکر اور اس پر عمل کیا جا رہا تھا' حکومت کی کارروائیوں کے مؤثر ہونے کا جواز ایک سوال بن کر کھڑا تھا۔ کیا جنگ کا جارحانہ ہتھیار دہشت گردوں کو جڑ سے اکھاڑ دے گا یا التاان کے پنپنے کا ماحول پیدا کرے گا؟

اب ہم نیویارک میں ایک ٹیبل کے گرد جمع ہو کر باری باری وہ حالات بیان کر رہی تھیں جو ہمیں کمیونٹی میں 11 ستمبر کے بعد کے ہفتوں میں پیش آئے تھے۔ ہم نے مل کر اپنی مفصل تصویر کشی شروع کی اور اس بات کا اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ 11 ستمبر کے بعد ہم خواتین اور بین المذاہب تحریک کے لیے کیا کر سکتی ہیں' ہم سب نے اپنے نقطۂ نظر سے انتہائی اچھے اور انتہائی برے دونوں طرح کے مناظر دیکھے تھے' ہم سب اچھی طرح آگاہ تھیں کہ ہم بین المذاہب تعلقات کی ایک نئی ڈگر پر روانہ ہو رہے ہیں۔

عرب امریکن فیملی سپورٹ سنٹر نیویارک کی عامرہ جیبی براؤن نے 11 ستمبر کے حملوں کی خبریں سن کر طاری ہونے والے خوف کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا: ''اس وقت میں نواحی علاقے

میں ڈرائیونگ کر رہی تھی کہ اس دوران میں نے ریڈیو پر خبریں سنی اور پتہ چلا کہ کیا ہوا ہے' اس واقعے کو دوسری جنگ عظیم کے دوران پرل ہاربر پر جاپانی حملے سے تشبیہ دی جا رہی تھی۔ میری پہلی سوچ یہ تھی ......اوہ خدایا......اب ہمیں پکڑ کر کیمپوں میں ڈالا جانے والا ہے......'' انہوں نے اس کے بعد آنے والے ہفتوں میں عرب امریکن سنٹر کو درپیش مشکل حالات کا ذکر کیا۔اعتماد میں دراڑیں پڑنے کے اسی کیفیت کا حال جیوش آرتھوڈاکس فیمی نسٹ الائنس کی بلو گرین برگ اور ویمن آف ریفارم جوڈازم کی کیرولین کونین نے بیان کرتے ہوئے کہا کہ ٹی وی پر عرب ممالک کی سڑکوں پر جشن کے مناظر کتنے تکلیف دہ تھے' جو اینٹی امریکہ اور اینٹی اسرائیل جذبات کا اعادہ تھا' لیڈرشپ کانفرنس آف ویمن ری لیجئیس کی عہدیدار سسٹر ہیلن میری برنز کے احساسات بھی دیگر خواتین جیسے تھے' انہوں نے بتایا کہ ''جب دوسرا طیارہ ٹاور سے ٹکرایا تو اس لمحے میں نے اپنے اندر گہری اداسی محسوس کی' یہ غصہ نہیں بلکہ گہری اداسی تھی' جو اس روز سے آج تک ختم نہیں ہوسکی' یہ کیفیت اس سے قبل میں نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔''

مسلمان' عرب امریکن اور جنوب ایشیائی خواتین جو میز کے گرد بیٹھی تھیں سب نے غیر یقینی پر بنی خوف کا تجربہ کیا تھا۔ لاس اینجلس سے لیلیٰ المریاتی نے اپنے مدرسے اور مسجد کو ملنے والی دھمکیوں کی تفصیل بتائی اور اس کے علاوہ ان سے معلومات' وضاحت دینے اور تشریح کرنے کی لاتعداد درخواستیں بھی کی گئیں۔ مناوی تنظیم کی شمیتا داس گپتا نے اس نئی کشیدگی کا ذکر کیا جس سے ہندو اور مسلمان دونوں مذہبوں کی خواتین کو گزرنا پڑا' ان کی تنظیم امریکہ میں جنوبی ایشیا کی خواتین پر تشدد کی روک تھام کا کام کرتی ہے' انہوں نے بتایا کہ ان خواتین کو لگا کہ بیرونی طور پر وہ محصور ہیں جبکہ ان کے اندر ایک عجیب قسم کا تناؤ پایا جاتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ''ہم تو پہلے ہی جدوجہد کر رہی تھیں' کیونکہ ہماری کمیونٹی کی خواتین کو گھروں میں تشدد کے چیلنج کا سامنا ہے' لیکن نائن الیون کے واقعے نے مسلمان' ہندو اور سکھ کمیونٹی میں ہم آہنگی کی 17 سالہ کوششوں کو تقریباً تباہی کے دہانے پر پہنچا دیا تھا۔'' اب ہم لوگوں کو ایسی باتیں کرتے سنتے تھے: ''مسلم خواتین کو وہاں نہیں جانا چاہیے۔'' اس طرح ہمارا سنٹر پناہ گزیں مسلمان خواتین سے بھر گیا' ہندو کہتے ''ہمیں مسلمانوں کی

طرح شلوار قمیض نہیں پہنی چاہیے اور اب ہمیں ماتھے پر بندیا (تلک) لگانا ہوگا تا کہ ہمیں مسلمان نہ سمجھا جائے۔'' ایک لحاظ سے اب ہم اپنی ہی کمیونٹیوں کے خلاف برسر پیکار تھے۔

سکھ خاتون نوجوت کوَر نے گزشتہ 6 ہفتوں کے دوران اپنی تنظیم سکھ میڈیا واچ اینڈ ریسورس ٹاسک فورس (سمارٹ) کے پاس درج کرائی گئی شکایات کی تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ سکھوں کو ان کی پگڑیوں کی وجہ سے نشانہ بنایا گیا' یہ ایک ایسے ملک میں جہالت اور عدم تحفظ کی مثالیں ہیں جو اپنے نئے شہریوں سے ناآشنا تھا۔ ان دنوں ہراساں کرنے' تشدد اور حملوں کے کئی واقعات رونما ہوئے' امریکی ریاست ایری زونا کے شہر میسا میں ایک سکھ بلبیر سنگھ سوڈھی کو محض اس لیے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا کیونکہ اس نے جو پگڑی پہنی تھی وہ اسامہ بن لادن کی پگڑی سے مشابہ تھی۔ نوجوت نے بتایا ''ایک طرف جہاں 11 ستمبر نے امریکی قوم کو متحد کیا وہاں اقلیتوں کے خلاف نفرت انگیز کارروائیوں کی راہ بھی کھل گئی' صرف سکھ مردوں کو مصیبت کا سامنا نہیں کرنا پڑا بلکہ سکھ خواتین بھی ایسی ہی مشکلات سے دوچار ہوئیں۔ کچھ سکھ خواتین بھی پگڑیاں باندھتی ہیں' بعض دیگر شلوار قمیض پہنتی ہیں ان سب کو اسی وجہ سے نشانہ بنایا گیا' یا پھر ان پر حملوں کی وجہ ان کی رنگت تھی۔''

باہمی اعتماد میں کمی اور تشدد پھیلنے کے ساتھ ہماری اس میٹنگ میں ایک اور اہم نکتہ ابھر کر سامنے آیا: ایک طرف جہاں امریکہ میں اقلیتوں پر حملے کیے گئے وہاں ان سے ہمدردی کے جذبات بھی دیکھنے میں آئے۔ ایک طرف نائن الیون کے بعد اقلیتوں کو ہدف بنایا گیا وہاں ردعمل کے طور پر اس ہدف کو ہدف بھی بنایا گیا اور ایسی کارروائیوں کو قطعی مسترد کر دیا گیا' اس دوران ٹھوس جوابی اقدامات بھی نظر آئے اور ہر واقعے کے بعد کچھ حلقوں کی جانب سے تعاون کا ہاتھ بھی بڑھایا گیا اور لوگوں کو باہم جوڑنے کی کوششیں کی گئیں' اس کی وجہ 9/11 کے بعد پھیلنے والا خوف' غصہ اور اداسی تھی۔

اس ضمن میں عامرہ جیبی براؤن نے نیویارک میں عرب امریکن سکیورٹی کے ایک اقدام کی تفصیل بتائی جو حملوں کے مشترکہ خوف کے جواب میں اٹھایا گیا۔ انہوں نے بتایا ''ہم نے سوچا کہ ہم ایک محافظ گروپ تشکیل دیں کیونکہ ہم نے سنا کہ نائن الیون کے بعد بچے سکولوں میں نہیں جا رہے' عرب بچے اور ان کی مائیں گھروں سے باہر جانے سے کترا رہے تھے' جس کے بعد ہم نے

چوکیداری نظام وضع کرنے کا منصوبہ بنایا اور ہمیں سینکڑوں افراد نے کہا کہ وہ اس میں شمولیت کے لیے تیار ہیں۔نتیجتاً ہمارے پاس ایک ہزار سے زائد رضا کار جمع ہوگئے۔''

11 ستمبر کو اسلامک سنٹر ٹولیڈو کے شیشے کے گنبد پر رائفل کی گولی سے فائر کیا گیا' تاہم شریفہ قادری نے بتایا کہ ''ہمارے قریب ایک عیسائی ریڈیو سٹیشن موجود ہے'انہوں نے ہم سے رابطہ کیااور کہا کہ ہم آپ کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔انہوں نے اعلان نشر کیا کہ مسجد کے تحفظ کے لیے لوگ باہر آئیں اور اس کے گرد حفاظتی حصار قائم کریں تاکہ مسلمان بحفاظت عبادت کرسکیں۔'' شریفہ قادری حیران تھیں کہ یہ قدم قطعی اجنبی لوگوں کی طرف سے ہماری مدد کے لیے اٹھایا گیا'ہم اندازہ کر رہے تھے کہ شاید 300 سے 500 تک لوگ ہماری مدد کے لیے وہاں آئیں گے لیکن 20 ہزار لوگ آن موجود ہوئے۔

اجلاس میں شریفہ الخطیب نے ہمیں مختصراً جو واقعات بتائے وہ ہمارے نزدیک موسمیاتی تبدیلی کے مترادف تھا'ان کے اپنے خدشات میں نائن الیون کے واقعات سے اس بین المذاہب ہم آہنگی کے اقدامات کو نقصان پہنچانا شامل تھے جو گزشتہ کئی برسوں سے امریکہ میں کیے جا رہے تھے' انہوں نے کہا کہ ''ہر کسی کے نزدیک ہر منفی اقدام کے جواب میں بلا مبالغہ کم از کم سو مثبت کارروائیاں کی گئیں' اس سے لوگوں کے اندر دوسرے افراد کو سمجھنے کی خواہش پیدا ہوئی' گہری اور تکلیف سے بڑھ کر مفاہمت کی خواہش ......بین العقائد ہم آہنگی کو زد پہنچنے کی شرح ان سو مثبت اقدامات کا ادراک کیے بغیر بڑھ سکتی تھی' انتہائی تشدد کے دوران بھی اس نوعیت کی تیز بازگشت سنائی دیتی رہی۔ میسا شہر میں بلبیر سنگھ سوڈھی کی ہلاکت کے بعد ان کے اہلخانہ سے اظہار یکجہتی کے لیے ہزاروں ایسے افراد جمع ہوئے جو اس سکھ نوجوان کو پہلے جانتے تک نہیں تھے۔اس طرح ورجینیا میں مسلمان کاظم برکات کے ایک سٹور پر پتھراؤ کے بعد سینکڑوں اجنبی افراد وہاں جمع ہوئے اور گلدستوں اور یکجہتی کے پیغامات کی بارش کردی۔

کئی ماہ گزرنے کے بعد یہ بات واضح ہوتی چلی گئی کہ نائن الیون بین المذاہب ہم آہنگی کے لیے جھٹکوں سے قطع نظر سنجیدہ مکالمے کی ضرورت کا محرک بن چکا تھا۔نومبر 2001ء میں ہم امریکہ میں محض بین العقائد تعاون کی نئی لہر کے آغاز کا سوچ رہی تھیں۔اجتماعیت پراجیکٹ کی ریسرچ کے

مطابق اس سوچ میں نائن الیون کے کئی ماہ بعد انتہائی اضافہ ہوا تھا' میمفس سے اریزونا' بوزمین اور مونتانا تک ان گنت امریکی قصبوں اور شہروں میں اب بین العقائد ایسوسی ایشنیں تشکیل دی گئی ہیں۔

یہ بات ماننا پڑے گی کہ مذاہب کے درمیان مکالمہ کوئی آسان کام نہیں ہے' قدامت پرست عیسائی رہنما اسلام کے خلاف دیدہ دلیری سے بیانات دیتے ہیں' مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان مکالمے کی کوششوں کو اسرائیل اور فلسطین میں امن نہ ہونے سے نقصان پہنچانا بنیادی انسانی حقوق کو سخت متاثر کرتا ہے۔ اے ایم ریڈیو پر مذاکرے میں ''اسلاموفوبیا'' ایک لازمی جزو بن چکا ہے لیکن ان رکاوٹوں کے باوجود مکالمہ باہمی تعلقات کی نئی گہرائیوں کی سمت بڑھا ہے۔ یہ لوگ نہ صرف دنیا بھر میں دور مقیم اپنے ہمسایوں کو سمجھ رہے ہیں بلکہ اپنے گلی محلوں میں موجود افراد کے ساتھ تعلقات استوار کر رہے ہیں۔

پھر وہ کون سی چیز ہے جس نے نئی قسم کے تعلقات کیلئے کھلنے والی کھڑکی بند کرنے کی کوشش کی؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ نفرت کا کوئی فعل رحم دلی کی گونج میں تبدیل ہوجائے؟ ہم نے امریکہ کے شہروں اور قصبوں میں گاہے بگاہے پیش آنے والے ان تجربات سے کیا سبق سیکھا ہے؟ دفاع کے لیے اپنے مکے تیار کرنے کی بجائے نئی شروعات کے لیے ہمارے دل کھلے ہیں' ایک سطح پر یہ سب کچھ فطری لگتا ہے' لیکن ایسے سے جنم لینے والی یہ صدا پالیسی سازی میں کیسے معاون ہوسکتی ہے۔ مقامی سطح پر سیکھے گئے ان اسباق کا قومی سطح پر دور تک شائبہ نظر نہیں آتا' اس کے برعکس دنیا بھر میں بننے والے طاقتور اتحاد پرتشدد حکمت عملی کے حامل ہیں اور 11 ستمبر کے چند ہی گھنٹوں کے بعد جنگ کی باتیں شروع کر دی گئی تھیں۔

نائن الیون کے بعد کے ان برسوں میں خواتین کی مذہبی تنظیموں نے اجلاسوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ اپریل 2002ء میں جب ہم ایک جگہ جمع ہوئیں تو امریکہ میں شہری حقوق کا بحران ہمارے ایجنڈے میں شامل تھا' حب الوطنی کے جذبے نے خوف اور شکوک وشبہات کی نئی فضا کو جنم دیا تھا' انتقام کی پالیسی زوروں پر تھی جس سے ایسی کمیونٹیاں الگ تھلگ ہوگئیں جن کے تعاون کی ہمیں ضرورت تھی۔ شریفہ نے بتایا کہ لوگ مساجد میں آنے سے خوفزدہ تھے' مسلم خیراتی اداروں کو چندہ

دینے اور احتجاج کرنے سے ڈرتے تھے۔ مسلمانوں کے گھروں اور دفاتر پر چھاپے مارے گئے۔ شمیتا داس داس گپتا نے ہمیں بتایا کہ ''11 ستمبر کے واقعے سے ان لوگوں کو وہ کچھ کرنے کا موقع مل گیا جو وہ پہلے کرنا چاہتے تھے۔ پہلا حکم براؤن رنگت والے افراد کی نظر بندی' ان پر چھاپے اور انہیں نشانہ بنانے کا دیا گیا' اب ہر کوئی ان اقدامات سے ڈرا ہوا ہے۔''

مئی 2003ء میں جب ہم پھر ملیں تو عراق میں جنگ شروع ہو چکی تھی اور ہم نے اپنے حلقے میں توسیع کرتے ہوئے دنیا کے دیگر حصوں کی بعض خواتین کو بھی اس میں شامل کر لیا' ہر فتح کے ساتھ لگتا تھا کہ جنگ توقع کے عین مطابق جبر کا ایک اور بیج بو رہی تھی۔ امریکہ میں مسیحی اخلاقیات کی ایک توانا آواز بیورلی ہیری سن نے نائن الیون کے ڈیڑھ سال بعد کہا تھا ''مجھے امریکہ سے محبت صرف اس کی جمہوری اقدار کے باعث ہے اور یہ انداز اب کھوتی جا رہی ہیں' ہمارے درمیان ایک قسم کی ''فاشزم'' پائی جاتی ہے لیکن ہم اس کی پہچان نہیں کر سکتے۔'' یہ نہایت بے باک الفاظ ہیں جو دل کے تار ہلاتے ہیں' یہودی تنظیم کی رہنما شیلا دیکلر نے کہا کہ ''امریکہ میں محض قوانین ہی تبدیل نہیں ہوئے بلکہ ایک قسم کی بے حسی بھی معاشرے میں در آئی ہے۔ کسی اور کو بھی فیصلہ کرنے کا موقع دیں' مجھے صرف آزادی اظہار کی نہیں بلکہ وسیع تناظر میں شہری بگاڑ کی فکر ہے' ہم امریکی بات کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے ہیں۔'' شریفہ الخطیب کا مشاہدہ ہے کہ ''ہمیں ایک نئی برائی کا سامنا ہے' ہمارا ملک بنیادی شہری حقوق اور سوچنے کی آزادی سے پیچھے ہٹ رہا ہے۔''

متاثرین نائن الیون تنظیم کی ٹیری راک فیلر ہمیں 11 ستمبر اور امید وبصیرت کے دور کی طرف واپس لے گئیں۔ وہ لفظوں کے پل باندھ کر ہمارے اندر خدشات محو کرتی رہیں۔ انہوں نے کہا کہ ''میری بہن ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی میں ہلاک ہوئی' لیکن آنے والے کئی ہفتوں میں میں نے اپنے اردگرد اجتماعی رحمدلی کا جذبہ محسوس کیا' جب میں ایک متاثرہ فرد کی حیثیت سے رپوٹ جمع کرانے کے لئے قطار میں کھڑی ہوئی تو لوگ میرے ساتھ پرتپاک طریقے سے ملے اور مجھے کافی پیش کی' جب میں ٹیکسی پر بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن پر ایک مظاہرے میں شرکت کے لئے گئی تو ڈرائیور نے کرایہ لینے سے انکار کر دیا' مجھے لگتا ہے اس سانحے کے بعد دنیا میں کوئی نہ کوئی تبدیلی ضرور آئی' ایسا صرف امریکہ میں نہیں باہر بھی ہوا' ماحول میں قابل ذکر کھلا پن آیا' امریکہ کے لئے ہمدردی اور یکجہتی

کا اظہار ہر جگہ کیا گیا لیکن پھر ہم نے یہ سب کچھ کھو دیا ہمیں دنیا سے دوبارہ منسلک ہونا پڑے گا۔''

پرامن کل ایسے لوگوں پر منحصر ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ ان کے پیاروں کی موت کا جواب مزید تشدد سے نہیں دیا جاسکتا' یہ متاثرین چند ہفتے قبل ایک بس پر بیٹھ کر کئی علاقوں میں گئے' انہوں نے پینٹا گون کے زیرو گراؤنڈ کے درمیان آبادیوں کا چکر لگایا وہ سب مل کر مارچ کرتے رہے اور ان کا نعرہ تھا ''مزید کوئی متاثر نہیں ہونا چاہیے''۔''ہمارے نام پر کوئی جنگ نہیں ہونی چاہیے'' جیسا کہ ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ جونیئر نے ویتنام جنگ کے دوران کہا تھا ''ہمارا ماضی اس لحاظ سے پیغمبرانہ ہے کیونکہ وہ زور دیتا تھا کہ پرامن مستقبل کے لئے جنگ کوئی حل نہیں''۔

مکالمہ رابطے کا عمل ہے' ابھی تک مذاہب کے درمیان ایسا کوئی مکالمہ نہیں ہوا' مکالمہ ہمیشہ لوگوں کے درمیان ہوتا ہے جیسا کہ ہم چھ مذاہب کے خواتین جمع ہوئی تھیں' مکالمہ عوام دشمنی نہیں اختلاف پر ہوتا ہے' اس کا مطلب کسی نکتے پر متفق ہونا نہیں بلکہ ایک دوسرے کو سمجھنا ہے۔مکالمے سے مظاہرے نہیں ہوتے بلکہ اس سے تعلقات جنم لیتے ہیں جیسا کہ شریفہ نے کہا ''ہمیں طویل المدت تعلقات قائم کرنے کی ضرورت ہے۔صرف ملاقاتیں کافی نہیں۔ایک بار ملنے سے معاملات حل نہیں ہوسکتے۔''

باب 4

عداوت کے ابواب بند کرتے ہوئے

راج موہن گاندھی

میں نوعمری کے دوران برصغیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں اور پاکستان اور بھارت کے درمیان دوستی کا خواب دیکھا کرتا تھا۔ اس مقصد کے لیے میرے دادا مہاتما گاندھی نے بلاشبہ اہم کردار ادا کیا اور 1948ء میں انہیں ایک جنونی ہندو نے محض اس لیے قتل کر دیا تھا کہ اس کے نزدیک گاندھی جی مسلمانوں اور پاکستانیوں کے بارے میں ضرورت سے زیادہ دوستانہ سوچ رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے بچپن سے زندگی کے آخری سانس تک (ان کی موت کے وقت میں ساڑھے 12 سال کا تھا) مہاتما گاندھی نے ہندو مسلم اتحاد کی جدوجہد جاری رکھی۔

اوائل عمری میں مجھ پر ایک اور حقیقت منکشف ہوئی کہ میرے دادا کی تعلیمات کے برعکس میں اپنے ہمسایہ ملک (پاکستان) کے بارے میں کدورت رکھتا ہوں؛ اس کا ثبوت 1951ء میں اس وقت ملا جب میں 16 سال کا تھا اور دہلی میں اپنے گھر میں بیٹھا تھا کہ میں نے ایک خبر سنی کہ وزیراعظم پاکستان لیاقت علی خان کو گولی مار دی گئی ہے، میں خبر سنانے والے کی طرف دیکھ کر کہا ''مجھے امید ہے ہم لیاقت علی خان کی موت کی خبر ضرور سنیں گے۔'' وہ شخص ان الفاظ پر ہکا بکا رہ گیا۔ مجھے شرم آئی کہ میں نے ایک ایسے شخص کی موت کی بات کی ہے جس نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ مجھے سمجھ آئی کہ اس نوعیت کی کدورت پورے برصغیر میں موجود ہے اور وہاں سے میرے اندر منتقل ہوئی۔

اس کے بعد آنے والے عشروں میں میں پاکستان اور بھارت کے مابین مذاکرات اور مصالحت کے لیے بلاتعطل لکھتا رہا۔ مجھے امید ہے کہ ایک دن آئے گا جب برصغیر میں عداوت کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔

11 ستمبر اور مابعد اثرات

حالیہ برسوں میں مغرب اور اسلامی دنیا کے درمیان قربت کے لیے میرا دل پہلے سے زیادہ دعائیں کرتا رہا ہے' جب نائن الیون ہوا تو اس وقت میں دہلی کے جنوب میں اپنے گھر میں تھا۔ میری بہن نے مجھے فون کر کے کہا کہ ٹی وی آن کرو' نیویارک میں عمارتوں پر حملے کیے گئے ہیں۔ باقی دنیا کی طرح آنے والے لمحات ٹی وی کے سامنے بیٹھے میں نے بھی خوف اور صدمے میں گزارے۔ میرا دل تخیل میں امریکہ پہنچ گیا' جیسا کہ ایک برطانوی مصنف نے لکھا ہے کہ اس روز پوری دنیا سے محبت اڑ کر امریکہ پہنچ گئی۔

نائن الیون نے سمندروں کو خشک کر دیا اور پوری زمین گویا خشکی کے راستے امریکہ کے ساتھ منسلک ہوئی' امریکہ کی سلامتی گم ہوگئی' اس کی الگ حیثیت' احساس تحفظ اور طاقتور انسانیت بھی محو ہوگئیں دوسری طرف 9/11 نے امریکہ کو دنیا سے خوفزدہ بنا دیا۔

دہشت گردی کے خلاف جنگ امریکہ کا ردعمل تھا...... جو بڑی حد تک قابل فہم' ناگزیر لیکن ابھی تک اس لحاظ سے ناکافی تھا کیونکہ اس میں پرتشدد علامات اور اس کی وجوہات میں فرق کو نظرانداز کیا گیا' جیسا کہ کمیونزم کے خلاف سرد جنگ اطمینان بخش نہیں سمجھی گئی اس طرح دہشت گردی کے خلاف جنگ جس میں برے انسانوں اور معاشروں کو ہدف بنایا گیا' کے بارے میں امریکہ کے اندر ایماندارانہ اور حوصلہ شکن ردعمل سامنے آیا جبکہ اسلامی دنیا میں بھی مخالفانہ جذبات نظر آئے۔

یہ سچ ہے کہ جہاں دہشت گردی کے خلاف جنگ کے طبل بجائے جا رہے تھے وہاں یہ سوال بھی اٹھایا گیا کہ ''یہ لوگ ہم سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟'' مختلف حلقوں کی طرف سے کیے گئے ان سوالوں کا جواب ہوتا تھا کہ ''انہیں آزادی سے نفرت ہے۔''

ذرا توقف کیجئے' کچھ لوگوں نے یہ نشاندہی کرنے کی کوشش کی' اس نفرت کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو ان کی آزادی اور زمین سے محروم کیا گیا اور عرب اس پر نالاں ہیں' اگر امریکہ فلسطین کی آزادی کی حمایت کرے تو امریکہ کے خلاف نفرت گرمجوشی میں بدل جائے گی' یہ دلیل کسی نے نہ سنی' اور مسلمان ملکوں پر حکمران آمروں کے خلاف شور میں کھوگئی جو اپنی سرزمین پر اپنے ہی لوگوں بالخصوص خواتین کو دبا رہے تھے' نائن الیون کے منصوبوں سازوں کے خلاف طاقت کے استعمال پر مبنی

اقدامات سے فرار ممکن نہیں تھا' لیکن دہشت گردی کا جواب دہشت گردی کے خلاف جنگ سے بڑا مقصد تھا لیکن یہ جواب اس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک اسرائیل عرب علاقوں پر قابض رہے گا اور امریکہ اس قبضے کو جائز قرار دیتا رہے گا۔ خود دار عرب قبضے کے خلاف مزاحمت جاری رکھیں گے جبکہ دانا عرب اس انداز میں مزاحمت کریں گے کہ انہیں عالمی برادری کی حمایت حاصل ہے' اس برادری میں امریکی اور اسرائیلی کمیونٹی بھی شامل ہوگی' جب مزاحمت کے نام پر معصوم بچوں' خواتین اور مردوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے تو اس سے بھی فلسطین کی آزادی کی آواز بلند ہوگی۔

اگر انصاف پسند خدائی کا کوئی وجود ہے تو جلد یا بدیر فلسطین کو انصاف مل کر رہے گا' لیکن اس خدائی کی زنجیر عدل خودکش بم دھماکوں میں مرنے والے بے گناہ افراد کے ورثا بھی ہلاتے ہیں' اس طرح اسرائیلی قبضے کے خلاف جواب اسرائیلی شہریوں پر حملے سے مختلف ہے' اس کے لیے خودکش حملوں کے لیے درکار معیارات سے بڑھ کر معیار درکار ہوں گے' اس کے لیے اس نیکوکاری کی ضرورت ہوگی جس پر قرآن مجید انتہائی زور دیتا ہے' یعنی صبر و برداشت......اس کے لیے عدم تشدد پر مبنی حکمت عملیاں بھی درکار ہوں گی۔

مہاتما گاندھی نے طاقتور قابض انگریز سامراج کے خلاف جدوجہد میں تشدد کو اس لیے مسترد کر دیا کیونکہ اس کے جواب میں معاشرے کے کمزور ترین لوگ نشانہ بنتے ہیں' عدم تشدد کے اقدامات مخالف کو حیران کر دیتے ہیں اور حریف کو شکست دینے کا باعث بنتے ہیں' میں جانتا ہوں کہ کس طرح کئی عرب گاندھی جی کے فلسفے پر یقین رکھتے ہیں۔

مغرب اور اسلام

مغرب اور اسلامی دنیا دونوں ایک ہی نسل کے افراد پر مشتمل ہیں۔ اس طرح مغرب اور اسلام کے درمیان نظر آنے والی تقسیم شاید جدید دنیا کی انتہائی تشویشناک تقسیم ہے۔

دونوں فریق خدائی عبادت کے دعویدار اور مساوات کی قدر پر یقین رکھتے ہیں' مسلمان زور دیتے ہیں کہ مساوات کی جتنی تعلیم اسلام دیتا ہے اتنی کسی اور مذہب میں نہیں ملتی۔ ایک طرف خدا کا تصور ہے جو انتہائی رحیم' رحمان اور عظیم ذات ہے۔ دوسری طرف انسانیت ہے' جس کے لیے مسلمان قرار دیتے ہیں کہ تمام انسان نسل' ذات' جنس اور قومیت سے قطع نظر برابر ہیں۔

یہی مؤقف مغرب کا ہے' امریکہ بھی یہی کہتا ہے 'امریکی حلف میں شامل ہے کہ سب کو برابر پیدا کیا گیا' عقیدے کا اظہار ہر سطح پر کیا جاتا ہے۔ صدر بش نے خود کئی بار یہ کہا کہ اس بات میں شبہ نہیں کہ خدا کی نظر میں تمام انسان برابر ہیں اور تمام انسانوں کی زندگی کی قیمت ایک ہی ہے۔

لیکن دوسری طرف اسلامی دنیا کی آوازیں امریکہ کو شیطان قرار دیتی ہیں' اسی طرح امریکہ سمیت مغرب میں کچھ حلقے اسلام کو کامل مذہب نہیں سمجھتے اور مسلمانوں کو ناقص خیال کرتے ہیں۔

اگر میں مسلمان ہوتا یا کسی اسلامی ملک کا شہری ہوتا تو مجھے کسی کے امریکہ کو شیطان کہنے پر حیرت محسوس ہوتی' اسی امریکہ نے لاکھوں غیر ملکی مسلمانوں کو عبادت کی آزادی دی' جہاں مسلمان اپنے عقائد کے مطابق زندگی بسر کر سکتے اور امریکہ کی قومی زندگی میں حصہ ڈال سکتے ہیں' وہی امریکہ جس نے بوسنیا اور کوسوو کے مسلمانوں کے حقوق کا دفاع کیا اور 1980ء کی دہائی میں سوویت یونین کے خلاف افغان مجاہدین کی دلیرانہ جدوجہد میں تعاون کیا...... یہ ٹھیک ہے کہ امریکہ نے بعض ایسی غلطیاں کیں جس سے کئی لوگوں کے دل مجروح ہوئے لیکن پھر بھی امریکہ کو شیطان کہنے والے حق بجانب نہیں بلکہ اس طرح بنی نوع انسان کی ترقی سے اسلامی دنیا کو دور رکھ کر اس کی توہین کی جا رہی ہے۔

اور ان لوگوں کے بارے میں کیا کہیں گے جو امریکہ سے کہتے ہیں کہ اسلام (نعوذ باللہ) ایک بدی ہے؟ میں ایسے کئی امریکیوں کو جانتا ہوں جو تینوں ابراہیمی مذاہب کی مشترکہ باتوں کو واضح کرنے کے ہر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہیں' میں ایسے کئی امریکی سکالروں کو بھی جانتا ہوں جو قرآن اور انجیل مقدس کے مشترکہ عناصر کی مثالیں دیتے ہیں...... مثال کے طور پر افتتاحی سورت فاتحہ میں اللہ کی بڑائی کا ذکر' انجیل کے شروع میں بھی ملتا ہے۔

کسی عیسائی یا یہودی کے لیے اسلام کو بدنام کرنے کا مطلب دراصل اپنے ہی قبیلے کی ساکھ متاثر کرنے کے مترادف ہے' حالانکہ یہ قبیلہ انتہائی شاندار ہے۔ یہ اقدام انتہائی مہلک ہے۔ مسلمان اور غیر مسلم دنیا بھر میں ایک دوسرے کے ہمسائے میں اتحاد و کشیدگی کے کئی درجوں کے اندر رہتے ہیں۔ نائیجیریا' بھارت' انڈونیشیا' فلپائن' جنوبی افریقہ' بنگلہ دیش' لبنان' مصر' قبرص' روس' یورپی ممالک اور امریکہ میں یہ ہمسائیگی قائم ہے۔ یہ سوچ کہ صرف مسلمان ہی خطرناک ہے' نہ صرف باہمی کشیدگی کو ہوا دینے کے مترادف ہے بلکہ اس سے تقسیم اور تشدد کا بھی خدشہ ہوتا ہے۔

لیکن ایک گہرا سوال بھی ہے، کئی مسلمان اس لیے مسلمان ہیں کیونکہ ان کا جنم ایک اسلامی کنبے میں ہوا، کئی امریکی اس لیے امریکی ہیں کیونکہ ان کی پیدائش امریکہ میں ہوئی۔ مراد یہ ہے کہ لوگوں کو محض ان کی پیدائش، خون اور ورثے کی بناء پر مطعون کیا جاتا ہے۔

ان تمام پہلوؤں کے باوجود دنیا نے لوگوں کو ان کی پیدائش اور والدین کی بناء پر مطعون کرنا، ہولوکاسٹ کی دہشت ناکی، غلامی اور بھارت میں چھوت کی برائی جیسے اقدامات سیکھے ہیں، ہم کچھ افراد کو محض ان کے مسلمان یا امریکی ہونے کے باعث مردود کرنے کو تیار نظر آتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ 9/11 کے حملہ آور خود کو مسلمان کہتے تھے اور ان کے حملے اسلام کے نام پر تھے۔ افریقی ملک روانڈا میں 1994ء میں چرچوں کے اندر قتل عام کیا گیا، تمام قاتل اور مقتولین عیسائی تھے، تو کیا اس فعل کو عیسائی جرم کہا جائے گا؟ جب بدھ اور ہندو سری لنکا میں خوفناک تصادم میں الجھے ہوئے ہیں تو کیا اس کا الزام ہندوازم اور بدھ مت کو دیا جائے گا؟ نازی ازم اور کمیونزم مقتدر رہے، ہولوکاسٹ عیسائی سرزمین پر کیا گیا تو کیا ہم اسے عیسائیت کا نقص قرار دیں گے؟

عیسائی معاشروں میں غلامی کی حوصلہ افزائی کی گئی اور زیادہ تر عیسائیت کے نام پر کی گئی تو کیا غلام بنائے گئے افراد عیسائیت کو مورد الزام ٹھہرائیں؟ کیا نیلسن منڈیلا اپنے لوگوں کو عیسائیت کے جبر کے خلاف متحد کرتے؟

مجھے ستمبر 2003ء میں فاکس نیوز کے میزبان برٹ ہوم اور صدر بش کے درمیان وائٹ ہاؤس میں ہونے والا مذاکرہ دیکھنے کا موقع ملا، ہوم نے صدر سے پوچھا آپ کس سے متاثر ہیں؟ تو صدر بش نے کمرے میں لگی ابراہام لنکن کی تصویر اور ان کی تعلیمات کی طرف اشارہ کیا، جب سوال کیا گیا کہ کیسے متاثر ہیں تو صدر نے جواب دیا کہ امریکہ میں خانہ جنگی کے دوران لنکن نے امریکی اتحاد کی جنگ لڑی، اس طرح 9/11 کے بعد میں نے بھی اس فلسفے کی روح پر عمل کرتے ہوئے امریکی اتحاد کے قیام کی جدوجہد کی۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ سوال ہونا چاہیے تھا کہ آج اگر ابراہام لنکن زندہ ہوتے تو وہ کیا کرتے؟ ہم حقیقی جواب کے بارے میں تو کبھی آگاہ نہیں ہوسکتے لیکن اسے جاننے کی کوشش ضرور کر سکتے ہیں، سب جانتے ہیں کہ خانہ جنگی کے دوران لنکن نے کہا تھا: دونوں فریق ایک ہی بائبل پڑھتے ہیں، ایک

ہی خدا کی عبادت کرتے ہیں اور دونوں اپنی مدد کے لیے خدا کے طلب گار ہیں۔ یہ حیران کن نہیں کہ دوسرے فریق کے منہ سے نوالہ چھیننے کے لیے خدا سے مدد مانگی جائے لہٰذا ہمیں انصاف کرنا ہوگا کہ ہمارے ساتھ ایسا فیصلہ نہ کیا جائے۔

جب میں لنکن کے یہ الفاظ دیکھتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ یہ الفاظ امریکہ کے اندر دونوں فریقوں کے لیے اثرانگیز نہیں۔ گاندھی' مارٹن لوتھر کنگ جونیئر اور لنکن کو آج جو چیلنج درپیش ہوسکتا تھا وہ صرف امریکی اتحاد کا حصول نہیں بلکہ عالمی سطح پر تقسیم کا علاج ہے۔

نائن الیون کے بعد جب امریکہ مشکل کا شکار دیگر تمام دنیا سے منسلک ہوا لیکن عراق میں ہونے والے واقعات کے بعد امریکی صرف اپنے ملک کے اتحاد کا نہیں سوچ سکتے' اگرچہ آج امریکہ کو اپنے اندر بڑی تقسیم کا سامنا ہے۔ اس کے لئے امریکی لوگ باہمی ایماندارانہ مذاکرات کر سکتے ہیں۔ نائن الیون اور عراق جنگ کے بعد' امریکہ سمیت پوری دنیا کو اتحاد اور منظم ہونے کی کوششیں کرنا ہوں گی تاکہ معاشرے میں منصفانہ اور دیرپا امن قائم ہوسکے۔

اس کے لیے اسلامی اور عرب دنیا میں ایماندارانہ سوالات بھی ضروری ہیں۔ یقیناً یہ اسرائیلی قبضے کے خلاف نئی حکمت عملیوں کے سوچنے کا وقت ہے' اس کے لیے عربوں اور مسلمانوں کے اندر گہرے اختلافات پر بھی نظر رکھنا پڑے گی۔ جن کا اسرائیل اور امریکہ سے کوئی تعلق نہیں' نئی سوچ کو ان قدیم دشمنیوں سے الگ رکھنا ہوگا جن سے مسلمان تقسیم کا شکار ہیں' مسلمان .....عرب تھنک ٹینک کہاں ہیں جو جمہوریت اور مساوات کی تلاش کے لیے سرگرداں ہیں؟ کیا عرب تعمیر نو کے لیے کافی ستائش کا جذبہ موجود ہے؟ مثال کے طور پر تباہ حال بیروت کو لے لیں۔ بلاشبہ عرب تفاخر اس تخلیقی عمل سے بڑھا ہے جو کہتا ہے: ہم اپنی توانائیاں عربوں کے دشمنوں کی مذمت کے لیے صرف نہیں کریں گے بلکہ ہم نیا بیروت تعمیر کریں گے۔

کیا اسرائیلی اور امریکی فلسطین کے سوال پر توجہ نہیں دینا چاہیے؟ بدحالی کا شکار عربوں اور مسلمانوں کے کیا آپشن ہوسکتے ہیں؟ اسرائیل اور امریکہ پر بتدریج دباؤ میں اضافہ ہونا چاہیے لیکن مسلمانوں اور عربوں کی حالت زار کے لیے کوششوں سے بھی فرار نہیں ہونا چاہیے اور یہ دونوں چیزیں کسی تصادم میں ناگزیر ہیں۔

حرف آخر: کشمیر پر مذاکرات

ایک بھارتی اور ہندو ہونے کے ناتے مجھے ہندو معاشرے پر روشنی ڈالنے سے گریز نہیں کرنا چاہیے، مجھے 2002 میں بھارتی صوبہ گجرات میں مسلمانوں پر حملوں پر سخت غصہ آیا تھا۔اس بات پر بھی غصہ تھا کہ صوبائی اور مرکزی حکومتوں نے اس کے تدارک کے لیے کافی اقدامات نہیں کیے تھے۔ میں یہ بھی اعتراف کرتا ہوں کہ کشمیر میں شورش بھارتی پالیسیوں کی ناکامی ہے۔

تاہم میں سابق بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کی کوششوں کا معترف ہوں جنہوں نے مسئلہ کشمیر کے حل اور بھارت سے تعلقات کے قیام کے لیے نئی کوششوں کا آغاز کیا، میں بی جے پی کا حامی نہیں ہوں، بلکہ مجھے اس جماعت کے بعض اتحادی گروپوں کی طرف سے ہندوؤں کی بالادستی کی کوششوں پر سخت اعتراض ہے،لیکن پاکستان اور بھارت کے تعلقات میں بہتری لاناسٹیٹس مین کی خوبیوں کا حامل ہے۔ آیئے امید کریں کہ موجودہ اور مستقبل کی پاکستان اور بھارتی حکومتیں اس مذاکراتی عمل کو آگے بڑھائیں گی۔

باب5

بنجمن فرینکلن کا تحفہ رواداری

والٹر آئزک سن

بیسویں صدی کی بڑی جدوجہد فاشزم اور پھر کمیونزم کے خلاف کی گئی' جیسا کہ ہم نے 11 ستمبر کے موقع پر واضح کیا کہ 21ویں صدی کی سب سے بڑی جدوجہد جنونی بنیاد پرست قوتوں اور رواداری کی حامل طاقتوں کے درمیان ہوگی۔

یہ بات یاد رکھنا اہم ہے کہ امریکہ مذہبی رواداری کی بناء پر معرض وجود میں نہیں آیا تھا لیکن یہاں یہ اچھائی بدرجہ اُتم موجود ہے بلکہ ایک دیومالا تو یہ بھی پائی جاتی ہے کہ امریکہ کے اولین آبادکار مذہبی آزادی کے علمبردار تھے۔ درحقیقت بوسٹن کے پروٹسنٹ مسیحی (Pureitans) حددرجہ عدم رواداری کے حامل تھے' وہ نہ صرف جادوگردی بلکہ قبائلی قدامت پرستوں کے منحرفین کے بھی مخالف تھے' مذہبی اخلاقیات سے عاری انتہائی پراسرار فرقے نے لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ رہوڈ آئی لینڈ جیسی نئی ریاستوں کی طرف مراجعت کرلیں۔ انہی متعصب جنونیوں سے تنگ آ کر امریکہ کے عظیم سٹیٹس مین بنجمن فرینکلن کو وہاں سے نکلنا پڑا اور پھر وہ فلاڈلفیا میں جاگزیں ہوئے جو دیگر دنیا کی بہ نسبت ایک مختلف جگہ تھی' وہاں لوتھری' مارومین کوئیکر حتیٰ کہ یہودی بھی نہایت برادرانہ طور پر رہتے تھے۔ فرینکلن نے ان تمام عقائد کے لوگوں کو سبق دیا کہ معاشی اور انفرادی آزادی اس صورت میں حاصل ہوگی اگر سب رواداری کا رویہ اختیار کریں گے۔

فرینکلن خدا اور مذہب کے سماجی لحاظ سے مفید ہونے پر یقین رکھتے تھے لیکن وہ کسی مخصوص فرقہ وارانہ نظریے کے حامی نہیں تھے' اسی وجہ سے انہوں نے چندہ جمع کر کے فلاڈلفیا میں ایک نیا ہال تعمیر کرایا' جہاں ہر مذہب کا مبلغ اپنے عقیدے کی تبلیغ اور نظریات کا پرچار کرسکتا تھا' یہاں تک کہ

انہوں نے لکھا ''حتیٰ کہ قسطنطنیہ کے مفتی اعظم کو بھی اسلامی تعلیمات کی تبلیغ کے لیے علماء بھیجنے کے لیے کہا جاتا تو ہم انہیں بھی اس ہال میں سروس مہیا کرتے۔''

انہوں نے پیورٹن عقیدے کی عدم رواداری کے خلاف مزاحیہ ڈرامے بھی لکھے' ان میں سے ایک کا عنوان تھا ''ماؤنٹ ہیلی پر ایک جادوگر کا ٹرائل'' اس میں ملزم جادوگروں کے ایک گروہ کو دو ٹیسٹ میں سے گزرنا تھا' ایک یہ کہ ترازو پر بائبل کے ساتھ وزن کریں' دوسرا انہیں ہاتھ پاؤں باندھ کر دریا میں اچھال کر دیکھا جائے کہ آیا وہ دریا میں تیر سکتے ہیں' وہ اس پر آمادہ ہوگئے...... شرط یہ تھی کہ دو مدعی بھی اسی ٹیسٹ سے گزریں گے' فرینکلن نے ان مناظر کو نہایت رنگین اور لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ مدعی اور ملزم تمام بائبل کے ساتھ وزن کرنے میں کامیاب ہوگئے' لیکن دو ملزم اور ایک مدعی دریا میں ڈوبنے میں ناکام رہے' جس سے ثابت ہوا کہ وہ جادوگر تھے۔ زیادہ ذہین تماشائیوں کا کہنا تھا کہ اکثر لوگ قدرتی طور پر پانی کے اوپر بہہ سکتے ہیں' لیکن دیگر کئی افراد کو اس کا یقین نہیں تھا' لہٰذا طے یہ ہوا کہ حتمی فیصلے کے لیے گرمیوں کا انتظار کیا جائے جب کپڑوں کے بغیر یہ ٹیسٹ کیا جائے۔

بینجمن فرینکلن کی آزادانہ سوچ سے ان کی فیملی کو بھی تشویش تھی' جب ان کے والدین نے ان کے ''باغیانہ'' خیالات پر پریشانی کا خط لکھا تو جواب میں فرینکلن نے جو خط تحریر کیا اس میں ایک ایسے مذہبی فلسفے کا خاکہ دیا گیا ہے جس کی بنیاد رواداری پر تھی اور جو ان کی تمام زندگی میں برقرار رہا' یہ بات کسی بھی شخص کے لئے فضول ہوگی کہ وہ یہ سمجھے کہ جن نظریات پر وہ عمل پیرا ہے وہ سچ ہیں اور جو وہ مسترد کرتا ہے وہ تمام جھوٹ ہیں۔ یہی منطق مختلف مذاہب کے لئے بھی ہے' انہوں نے اس نظریاتی امتیاز کے بارے میں بہت کم حوالہ دیا جس پہ ان کی والدہ کو پریشانی تھی' وہ لکھتے ہیں ''میں سمجھتا ہوں کہ کسی متحرک مذہب کو ہمیشہ اس وقت نقصان پہنچتا ہے جب اس میں نیکی کی جگہ قدامت پرستی کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے' اور صحیفہ پڑھ کر مجھے یقین ہوا کہ حشر کے روز ہم سے اس بات کی باز پرس نہیں ہوگی کہ ہم نے کیا سوچا بلکہ یہ پوچھا جائے گا کہ ہمارے اعمال کیا تھے...... یعنی ہمارا انسانوں کے ساتھ سلوک کیا رہا' دیکھیئے میتھو 25 '' (ان کے والدین جو صحیفے سے بہت کم آگاہ ہوں گے نے یقیناً اسے میتھو 25 سمجھا ہوگا)۔

فریکلن کا یقین تھا کہ مختلف نظریات پر بحث شروع کرنے کے لئے لچک ضروری ہے' یہ ان کے نزدیک صرف عملی نیکی نہیں بلکہ اخلاقی بھی تھی' اس کی بنیاد تمام اخلاقیاتی نظاموں کے نظریے پہ تھی کہ ہر فرد احترام کا مستحق ہے۔ امریکہ کے آئین کی تیاری کے کنونشن کے دوران وہ متفقہ دستاویز کی تیاری اور فیصلہ کن مصالحانہ کردار ادا کرنے کے لئے اپنے کچھ عقائد پر سمجھوتے کے لئے تیار ہوگئے' ایسا شاید کبھی ممکن نہ ہوسکتا اگر ان کے اردگرد محض صلیبی جنگجو ہوتے جو اپنے اصولوں میں کوئی تبدیلی کرنے کو تیار نہ ہوتے' سمجھو تہ کرنے والے شاید عظیم ہیرو تو نہیں بناتے لیکن ان کے ذریعے جمہوریتیں ضرور وجود میں آتی ہیں۔

اپنی زندگی کے آخری ایام تک وہ فلاڈلفیا میں ہر فرقے کے لئے فنڈز جمع کرنے کے لئے کردار ادا کرتے رہے' انہوں نے اپریل1978ء میں یہودیوں کے نئے معبد کی تعمیر کے لئے 5 پاؤنڈ بھی دیے' اُسی سال ۴ جولائی کو امریکہ کے یوم آزادی کی تقریبات کے موقع پر اتنے علیل ہوگئے کہ ان کا بستر پر سے اٹھنا تک ممکن نہیں رہا' لیکن وہ کھڑکی سے نیچے پریڈ ہوتی دیکھتے رہے۔ پہلی بار فرینکن کے اقدامات کے تحت نہ صرف مختلف عیسائی فرقوں کے لوگ بلکہ یہودی اور عیسائی عالم بھی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے وہاں شریک تھے۔

ایک ایسی دنیا جو اس وقت تھی ۔افسوس آج بھی ہے ۔ جہاں خونریز ملائیت مسلط کرنے کی کوششیں کی گئیں ۔بینجمن فرینکن نے ایک ایسی قدم کی تعمیر کی جو اپنی قوت مذہبی اجتماعیت سے حاصل کرسکتی تھی' اور اداروں کے اطمینان بخش تصور' جبر کی نفی' اظہار کی آزادی' سمجھوتے کا عزم' افراد کے احترام' حتیٰ کہ مزاح اور لچک والی ممتاز اقوام اور افراد ایک بہتر اور پرامن دنیا کی تشکیل میں مدد کریں گے۔



باب6

خدا کا وعدہ اور دنیوی سیاست

آرچ بشپ ڈیسمنڈ توتو

نسل پرستی کے خلاف جدوجہد کے دوران وہ عناصر جو نسل پرست حکومت کے حامی تھے نے مجھ پر الزام لگایا کہ میں مذہب کو سیاست سے ملانے کے مکروہ جرم کا مرتکب ہوا ہوں' انہوں نے کہا کہ میں ایک سیاستدان تھا اور اب آرچ بشپ بننے کی سرتوڑ کوشش کر رہا ہوں' دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ معاشرے کے مراعات یافتہ لوگ تھے' اور اس غیر منصفانہ ''سٹیٹس کو'' سے فائدہ اٹھا رہے تھے' جس کو قابل مذمت گردانا جا رہا تھا اور یہی میرا ایشو تھا' اس کے برعکس معاشرے کا مظلوم طبقہ سوچتا تھا کہ میں زیادہ سیاسی آدمی نہیں ہوں' مراعات یافتہ طبقہ مذہب اور سیکولر, مقدس اور مطعون , روحانیت اور مادیت کی تقسیم سے متاثر نظر آتا ہے۔ایک ایسا ملک جس میں آئینی طور پر چرچ اور ریاست کے امور کو الگ رکھا گیا ہو میں ستم ظریفی ہے کہ سیاستدان مذہبی امور پر اچھا خاصا اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔اس طرح مذہبی حلقوں میں مداخلت سے معاملات متاثر ہوتے ہیں اور امریکہ کی طرح سرکاری پالیسیوں کی وکالت کی جاتی ہے' وہ لوگ جو خود کو اخلاقی اکثریت قرار دیتے ہیں بھی مخصوص ایجنڈے کو فروغ دینا چاہتے ہیں' اس طرح سیاسی امیدواروں کا وطیرہ ایسا ہی ہے جو ان گروہوں کا پسندیدہ ہے۔سیاستدان جانتے ہیں کہ ان کا اسقاط حمل اور ہم جنس پرستی پر موقف بعض مذہبی لوگوں کی حمایت اور بعض کی مخالفت کا باعث بنے گا۔اگر یہ سیاست کو مذہب کے ساتھ ملانا نہیں تو میں نہیں جانتا کہ کیا ہے؟ اور جو سمجھتے ہیں کہ وہ ایسا نہیں کر رہے وہ چاند پانے کی تمنا کر رہے ہیں۔مذہبی عقیدے اور مذہبی کمیونٹی کا ایک طویل عرصے سے عوامی زندگی میں عمل دخل ہے۔وہ لوگ جو انہیں نظر انداز کرتے ہیں اپنے موقف پر عموماً پسپا ہوتے ہیں اور کف افسوس ملتے ہیں۔

بعض نوعیت کے مذہبی عقیدے کا تسلسل

مذہب اور سیاست میں بنیادی امتیاز اس وقت واضح ہو جاتا ہے جب ہم مذہبی عقیدے کے خدوخال کو سمجھ لیتے ہیں' یہ نسل درنسل انسانی بقاء کے مسحور کن پہلو ہیں۔ انسان جانوروں کی پوجا کر رہے ہیں اور یہ امر اتنا ہی کائناتی اور نا قابل تردید ہے جتنا کہ سانس لینا' یہ بات ہماری زندگی میں نہایت اہم ہوتی ہے کہ کس چیز یا کس کی عبادت کرتے ہیں۔ انسان کو بندگی کے لئے پیدا کیا گیا' یہ وہ نکتہ ہے جس کی وجہ سے انسان دیگر مخلوقات سے افضل' ذہین' طاقتور اور باعث احترام ہے اور اس بنا پر وہ خدا کے حضور جھکتا ہے۔ یہ بات ایک نہایت صحتمندانہ عمل ہے کہ بندہ اپنے رب کے روبرو اطاعت کا مظاہرہ کرے۔ بعض لوگ ایسے ہیں جو اس کی عبادت نہیں کرتے لیکن انہیں عبادت ضرور کرنی چاہیے۔ وہ کامیابی' خواہش یا سفلی جذبہ کو کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں ہوتے۔ انسان فطری طور پر مذہبی ہوتا ہے۔ مذہب' ہمیں یہ نہیں بتاتا ہے کہ وہ کیا ہے جس کی ہم عبادت کرتے ہیں اور عبادت سے کس قسم کا انسان بننے میں مدد ملتی ہے۔ مذہبی عقیدہ ایک پختہ عنصر ہے جسے تباہ نہیں کیا جاسکتا۔ بے عقیدہ حکومتوں کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ مذہب سے چھٹکارہ پانا آسان نہیں۔ نتیجتاً مذہب کو جتنا دبانے اور نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی اتنا ہی وہ پھلتا پھولتا رہا۔ سویت یونین کی کمیونسٹ حکومت نے آرتھوڈاکس چرچ اور دیگر عقائد کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن جتنی زیادہ کوشش وہ کرتے رہے مذہب اتنا ہی مضبوط ہوا اور بالآخر انہیں شکست ماننا پڑی۔ بدعقیدہ حکومت کے منفی ہتھکنڈوں کے باوجود معتوب مذہب پنپتا ہے۔ اس قسم کی مثال چین اور بعض دیگر ملکوں میں بھی نظر آتی ہے۔

مذہب ایک متحرک قوت ہے لیکن درحقیقت یہ قوت اخلاقی طور پر نیوٹرل ہوتی ہے' یہ نہ اچھی نہ بری ہوتی ہے۔ یہ مذہبی جذبہ ہی تھا جس سے مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کو امریکی شہری حقوق کی تحریک کے دوران انصاف اور مساوات کی جدوجہد کرنے کا حوصلہ ملا۔ یہ مدر ٹریسا کا عقیدہ تھا جس کی بنا پر وہ کلکتہ میں کوڑیوں اور اچھوتوں کے علاج معالجے کے لئے کام کرتی رہیں۔ یہ دلائی لامہ کا عقیدہ تھا

جس کے باعث وہ اپنی پیاری سرزمین تبت سے کئی برسوں سے دور جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور زندگی میں جن بڑی شخصیات سے ملنے کا مجھے اعزاز حاصل ہوا ان میں محترم دلائی لامہ انتہائی عظیم شخصیت ہیں لیکن مذہب نے بعض دیگر حالات میں کافی برے اثرات بھی مرتب کئے ہیں۔ وہ لوگ جنھوں نے اسقاط حمل کا آپریشن کرنے والے ڈاکٹروں کا قتل کیا سمجھتے ہیں کہ انہوں نے مذہبی فریضہ ادا کیا ہے۔ عیسائی مقدس سرزمین (فلسطین و یروشلم) سے مخالف عقیدے کے افراد کو نکال باہر کرنے کے لیے وہاں صلیبی جنگیں لڑنے گئے۔ یورپ میں ایک ہی عقیدے کے افراد کے درمیان کئی بار جنگ کے شعلے بھڑکے اور بدقسمتی سے یہ ابھی تک برقرار ہے۔ آئرلینڈ میں عیسائیوں کے فرقوں کے درمیان کشیدگی اس کی ایک مثال ہے۔ اس طرح عراق میں سنی اور شیعہ مسلمانوں کے درمیان خون ریز کشمکش بھی سب کے سامنے ہے۔

مذہب اولیاء اور خودسر دونوں قسم کے افراد پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے؛ اسی سے ظلم و جبر کرنے والے پیدا ہوسکتے ہیں؛ اس کا اصل انحصار اس بات پر ہے کہ مذہب کا/کی پیروکار اس کی تعلیمات کو کیسے لیتا/لیتی ہے۔ یہ بات اس تناظر میں نہایت اہمیت کی حامل ہے جبکہ ہم تہذیبوں کے درمیان لڑائی کی بات نہایت شد و مد سے کر رہے ہیں اور بعض جنونی عناصر کی کارروائیوں کے ڈانڈے مذہب سے جوڑ رہے ہیں؛ اس طرح ہم بڑی آسانی سے گھسے پٹے انداز کی جانب پھسل جاتے ہیں؛ چونکہ کچھ بلکہ شاید کئی ایسے افراد جنھیں دہشتگرد کہاجاتا ہے مسلمان ہیں لہٰذا ہم یہ سوچنے میں تاخیر نہیں لگاتے کہ اسلام جنگ و جدل کا مذہب ہے اور اس کے پیروکار دہشت گردانہ کارروائیوں میں ملوث ہوتے ہیں۔ ان کے بعد ہم تمام عربوں بالخصوص مشرق وسطیٰ کے عربوں پر شبہ کرنے لگتے ہیں؛ پھر مذہبی تعصب کے بڑھتے اثر سے مغلوب ہوکر ہم ہر اجنبی کو مشکوک سمجھتے ہیں۔ یوں کئی مغربی باشندوں کو یہ جان کر انتہائی دھچکا لگتا ہے کہ بوسنیا کے مسلمان نسلی طور پر بالکل ان جیسے ہی نظر آتے ہیں اور وہ ویسے نہیں جیسا کہ ان کے نزدیک مسلمانوں کو نظر آنا چاہیے۔ یہ بات نہایت بدقسمتی ہے کہ محض چند انتہا پسند مسلمانوں کی طرح بعض پیروکاروں کی بنیاد پر تمام مذہب کو ایک ہی

چھڑی سے ہانکا جائے' عیسائیوں کے اس بات پر غم و غصے کا جواز موجود ہے جب ان کے ہم مذہب انتہا پسند ان ڈاکٹروں کو خدا کی خواہش کے مطابق قتل کر دیں جو اسقاط حمل کی کارروائیوں میں ملوث ہوتے ہیں یا ایسے افراد جو ہم جنس پرستی کی زندگی پسند کرتے ہیں کو نشانہ بنایا جائے' یا پھر کوکلکس کلان جیسے لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی نسل پرستی کی توثیق صحیفوں میں بھی ہوتی ہے اور یہ لوگ اپنی مذموم سرگرمیوں کے لیے عیسائیت کا نام استعمال کرنے میں بھی شرم محسوس نہیں کرتے' یہ گمراہ لوگ کسی سیاہ فام کا گھر یا عبادت گاہ نذر آتش کرتے ہوئے صلیب کا نشان تک بنانے سے نہیں کتراتے' ہم سب میں سے کوئی بھی یہ نہیں سمجھے گا کہ یہ عناصر عیسائیت کے مرکزی دھارے کے لوگ ہیں۔

ہم سب کو حقیقت پسند اور قطعی غیر متزلزل نظریے کا حامل ہونا چاہیے۔ دنیا میں کسی عقیدے کی محض تعلیمات کی بناء پر دوسرے عقیدے کے ساتھ کوئی جنگ نہیں' اسلام اور عیسائیت یا اسلام اور یہودیت میں ہرگز کوئی لڑائی نہیں' یہ مختلف مذاہب کے پیروکار ہیں جو تمام اقسام کی قابل نفرت سرگرمیوں بشمول دہشت گردی اور تشدد میں ملوث ہیں' اوکلوہاما کے بمبار کا کیشیائی اور مسیحی تھے لیکن اس سے عیسائیت پر تشدد مذہب قرار نہیں پاتا جو اپنے پیروکاروں کو دہشت گردی کی تعلیم دیتا ہو' دہشت گردی کبھی عیسائی' کبھی مسلمان اور کبھی یہودی وغیرہ ہوتے ہیں' دہشت گردی کی وجوہات ان کے عقیدے نہیں حالات میں مضمر ہوتی ہیں۔ بے انصافی' جبر' غربت' بیماری' بھوک' افلاس' جہالت اور بے شمار دیگر وجوہات' دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے ہمیں احمقانہ طور پر ''صلیبی جنگ'' کی بات نہیں کرنی چاہیے' بلکہ ہمیں ان بنیادی وجوہات کا خاتمہ کرنا ہوگا' جو کسی کو دہشت گردی کے اقدامات پر اکساتی ہیں' دہشت گردی کے خلاف جنگ میں کامیابی ان وجوہات کے خاتمے تک ممکن نہیں۔

عقائد کی اہمیت

مذاہب کا اثر و نفوذ صرف گمراہ کن اور قابل ممانعت نہیں ہوتا' حیرت انگیز طور پر یہ وہ عنصر ہے جو بنی نوع انسانی کی بیش بہا کامیابیوں کا محرک ثابت ہوا' ہم نے کئی بے سروپا چیزوں کا بھی مشاہدہ

کیا ہے۔ میرے نزدیک عیسائیوں کو برداشت کے حامل دھڑے میں شامل ہونا چاہیے کیونکہ کئی حلقوں کا یہ خیال ہے کہ عیسائی ہی کئی مسائل کا موجب ہیں' ہم محض تماشائی بن کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ زیادہ تر دہشت گرد غیر مسیحی ہیں۔آخرکار انسانوں کو غلام بنانے والوں میں عیسائی پیش پیش رہے ہیں اور انہیں اپنے عقیدے کے برخلاف انسانوں کو غلام رکھنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتا تھا۔ وہ انسانوں کو صرف ڈھور ڈنگر سمجھتے رہے' یہ عیسائی جرمن نازی تھے' جنھوں نے دنیا کو ہولوکاسٹ کی دہشت دی' اٹلی میں فاشزم کو فروغ دیا جبکہ سپین میں جنرل فرانکو کے اقتدار میں فاشزم کی تقویت کا باعث بنے' وہ کافر نہیں عیسائی تھے جنھوں نے جنوبی افریقہ میں غیر انسانی عصبیت کے جواز کے لیے انجیل مقدس کے جھوٹے حوالے دیئے' وہ بھی ایک عیسائی رہنما (امریکی صدر) تھا جس نے ہیروشیما اور ناگاساکی کے نہتے معصوم شہریوں پر ایٹم بم برسانے کا حکم دیا' آئرلینڈ میں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے والے بھی عیسائی تھے' ہم عیسائیوں نے جو کچھ کیا وہ ہمارے سر شرم سے جھکانے کے لیے کافی ہے' لیکن اس کے باوجود ہمارے مذہب اور دیگر عقائد میں اتنا کچھ موجود ہے جس پر ہمیں ممنون ہونا چاہیے۔ یہودی عیسائیوں Judaeo-Christian کے عقیدے سمیت کئی مذاہب میں انسانیت سے متعلق اعلیٰ نظریات موجود ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ انسان دراصل خدا کا عکس ہے اور اس کی قدر و قیمت کائناتی ہے' اس کا انحصار ہرگز لسانیت' صنف اور رتبے پر نہیں' بلکہ اس میں تمام انسان برابر ہیں Imago Dei انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ ہے اور اسی وجہ سے پوری دنیا نسل پرستی اور رنگ کی بنیاد پر امتیاز کی مذمت میں متحد ہوگئی' خدا کے وعدے نے دنیوی سیاست کو غیر متزلزل طور پر متاثر کیا ہے' یوں نسل پرستی کے خلاف مختلف عقائد کے لوگوں کی ایک آواز انتہائی خوش کن امر ہے' ہم نے مسلمانوں' ہندوؤں' یہودیوں اور دیگر مسالک کے لوگوں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر نسل پرستی کے خلاف جدوجہد کی۔

تمام مذاہب ایک جیسی بنیادی اخلاقی اقدار کی تعلیم دیتے ہیں' ان میں ایمانداری' شادی پر یقین' سچائی' جرأت' رحمدلی' دوسرے کی فکر' ایک خاندان کے طور پر بنی نوع انسانی کا اتحاد اور امن

شامل ہیں۔ کوئی مذہب یہ نہیں سکھاتا کہ چوری کرنا' جھوٹ بولنا' دوسروں سے بدسلوکی یا کسی کا قتل کرنا اچھی بات ہے' تمام مذاہب اپنے اپنے انداز میں امن کا درس دیتے ہیں' یہی وہ اقدار یا مثالی ڈگر ہے جس کے لے دینوی سیاست کو جدوجہد کرنا چاہیے اور انہی اقدار کے بارے میں دنیا کی سیاست کو مطلع کرنا ہوگا۔

کئی عقائد اپنے پیروکاروں پر دیگر مخلوق سے حسن سلوک پر زور دیتے ہیں' ماحولیاتی مسائل انتہائی مذہبی اور روحانی معاملہ ہے' ماحولیات کو آلودہ کرنا' تباہ کن گلوبل وارمنگ نہ صرف ایک غلط اور مجرمانہ فعل ہے بلکہ اخلاقی لحاظ سے بھی اس کا کوئی جواز نہیں' یہ گناہ ہے۔

مذاہب کہتے ہیں کہ ہم ایک ہی کنبہ ہیں اور انسانی خاندان کی حیثیت سے ہماری منزل ایک ہے اور ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہے۔ کسی مذہب کے بارے میں یہ گمان کرنا کہ وہ دیگر لوگوں کی تکلیف کا باعث ہے بالکل غلط ہے۔ یہ کہنا کہ کسی مذہب میں خود سیر ہوکر کھانا اور دوسروں کو بھوکا رکھنا جائز ہے بالکل غلط ہے' اس طرح کسی اور کو بیمار دیکھنا بھی کسی مذہب کا سبق نہیں' کتنی بری بات ہے کہ ہم انسانوں کی تباہی کے لیے اسلحے پر ایک بڑا بجٹ خرچ کرتے ہیں لیکن اس سے بہت تھوڑی رقم سے ہم خدا کی مخلوق' اپنے بہن بھائیوں کو پینے کا صاف پانی' کھانا' تعلیم' صحت کی سہولیات اور مناسب گھر فراہم کر سکتے ہیں۔ ہم ایسا اس صورت میں کر سکتے ہیں اگر ہم اپنے مذاہب کی تعلیمات کا اثر قبول کریں۔

تمام عقائد کہتے ہیں کہ یہ کائنات اخلاقیات پر قائم ہے' بدی' بے انصافی اور جبر کبھی حرف آخر نہیں ہو سکتے۔ حقوق' اچھائی' محبت' ہنسی' کسی کی فکر' تعاون اور رحمدلی ان برائیوں پر حاوی ہوں گے۔ طاقتور بے انصافی جو کبھی بھاری ثابت ہوسکتی ہے لیکن جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا کلیہ بالاخر نقصان کا باعث بنتا ہے۔ حکمران اور سیاستدان کو جاننا چاہیے کہ ان کی طاقت خدمت کے لیے ہے نہ کہ ان کے ذاتی مفاد کے لیے انہیں اختیار دیا گیا ہے' یہ طاقت عوام کی امانت ہوتی ہے۔

حاصل بحث

اقوام متحدہ کی پالیسیاں...... جنگ یا تصادم کی بجائے ترقی، غربت کا خاتمہ، خواتین و بچوں کے حقوق میں پیشرفت، انصاف کا حصول، انسانی حقوق کا احترام، آزادی اور جمہوریت......نہ صرف آسمانی صحیفوں کا سبق ہیں بلکہ انہیں خدائی رحمت کی حمایت بھی حاصل ہے۔ اقوام متحدہ کے دفتر کے باہر ایک یادگار پر تحریر ہے ''ہمیں اپنی تلواروں اور تیروں کو کھیتی باڑی اور دیگر امدادی کاموں کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔'' عالمی امن کے فروغ کے ایسے اقدامات خدائی کام کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ مضمون آرچ بشپ ڈیسمنڈ توتو کے 17 مارچ 2004ء کو اقوام متحدہ میں لیکچر پر مبنی ہے اور ان کی اجازت سے کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

حصہ سوم

مکالمے اور مفاہمت کے راستے

باب 7

برداشت کے فروغ کے لیے میڈیا کا کردار

ششی تھرور

ستمبر 2002ء کے شروع میں اقوام متحدہ سے متعلق ایک انٹرویو کے لئے میں نارتھ کیرولائنا کے ایک ٹی وی سٹوڈیو میں موجود تھا۔ میں انٹرویو کے آن ایئر ہونے کا انتظار کر رہا تھا کہ مجھے بتایا گیا کہ انٹرویو اب اگلے روز چلایا جائے گا' ''جم کرو کا عروج و زوال'' کے عنوان سے امریکہ میں سیاہ فام باشندوں پر ظلم و جبر سے متعلق یہ ڈاکومنٹری تاریخی دستاویزات' تصاویر اور ان سیاہ و سفید فام امریکیوں کے انٹرویو پر مبنی تھی جو نسلی امتیاز کے دور سے گزرے تھے۔ ڈائریکٹر رچرڈ ورمسر نے کہا ''سمجھ میں نہیں آتا کہ تاریخی حقائق مدنظر رکھے بغیر ہم نسلی مسائل کا اب بھی کیوں شکار ہیں؟ ایک سفید فام کی حیثیت سے نسلی امتیاز میرا ابھی ورثہ ہے جیسا کہ یہ کالوں کا ورثہ ہے۔''

ایک بات جو فکرانگیز تھی کہ یہ ڈاکومنٹری ان امریکی ریاستوں میں چلائی جانی تھی جہاں سیاہ فام آبادی کو ووٹ کا حق نہ دینے' گوروں کے ریستوران میں کالوں کا داخلہ ممنوع قرار دینے' بسوں اور ٹرینوں میں انہیں الگ نشستوں پر بٹھانے اور گوروں جیسی تعلیمی سہولتوں سے محروم کرنے کی یادیں ابھی معمر افراد کے ذہنوں میں تازہ تھیں۔ اب یہ ٹی وی چینل سیاہ اور سفید فام لوگوں کو ماضی کے حالات میں مستقبل کو سمجھنے میں مدد دے رہا تھا' شمالی کیرولائنا کے سکول اس ٹی وی شو سے متاثر ہو کر اس کی تفصیلات کو سوشل سٹڈیز کے نصاب میں شامل کر رہے تھے اور طلباء کی حوصلہ افزائی کی جا رہی تھی کہ وہ رورل ہسٹری کے منصوبوں میں بھی اسی موضوع کو شامل کریں۔

یہ وہ شاندار کردار ہے جو میڈیا آج نسلی اور لسانی تقسیم کے خاتمے اور برداشت کے فروغ کے لیے ادا کر سکتا ہے اور بعض اوقات یہ کردار ہمیں نظر آتا ہے' لیکن یہی میڈیا الٹ کردار بھی ادا کر سکتا

ہے۔ غلط ہاتھوں میں لگنے یا غلط عزائم کی صورت میں یہی میڈیا نفرت اور تشدد پر اکسانے کا ہتھیار ثابت ہوسکتا ہے۔ افغانستان میں طالبان کے دور میں جہاں خواتین کو تعلیم کے حصول سے روکا جا رہا تھا وہاں سب لوگوں کی معلومات کے متبادل ذرائع تک رسائی بھی نہیں ہونے دی جا رہی تھی' ان حالات میں میڈیا کسی طرف سے قرآنی تعلیمات اور کلاشنکوف (قرآنی تعلیمات کی خام تشریح کی گئی جبکہ کلاشنکوف کی تیاری خام تھی) کے بیک وقت فروغ سے معاشرے اور انسانوں کے لیے تباہ کن اثرات مرتب ہوئے۔ افریقی ملک روانڈا میں 1994ء میں ریڈیو ملیس کولنز نے جارحیت' خوف اور لالچ کی حوصلہ افزائی کی جس کے تباہ کن نتائج سامنے آئے اور 80 ہزار افراد کا قتل عام کیا گیا۔ سابق یوگوسلاویہ کے کئی ریڈیو اور ٹی وی سٹیشنوں کی طرف سے جنگوں اور نسلی قتال کے دوران نفرت اور جھوٹ پر مبنی کردار کو کون بھول سکتا ہے؟

لیکن ''نفرت انگیز میڈیا'' عالمی سطح پر مسترد ہونے کے بعد خوش قسمتی سے اپنی روش تبدیل کر رہا ہے' کئی ملکوں میں پریس آزادی سے لطف اندوز ہو رہا ہے اور اس آزادی میں اچھی اور نقصان دہ دونوں اقسام شامل ہیں۔ اقوام متحدہ کے عہدیدار کی حیثیت سے میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں کہ میڈیا کا مخصوص کردار تجویز کروں' اس کے برعکس آزاد میڈیا کو وہی کچھ کہنا اور شائع کرنا چاہیے جو وہ موزوں سمجھتا ہے' اور انسانی حقوق کے عالمی ڈیکلریشن کے آرٹیکل 19 کے تحت میڈیا کو اپنا کردار کسی مداخلت کے بغیر ادا کرنے کا تحفظ حاصل ہے۔ خود مختار اور غیر جانبدار میڈیا جمہوریت کی عمارت کی اہم ترین اینٹیں ہیں۔ آزادی صحافت ایک ایسا مواد ہے' جو نہ صرف آزادی کی اینٹوں کو جوڑتا ہے بلکہ ان اینٹوں میں کھڑکی بھی وا کرتا ہے' تمام لوگوں بالخصوص غریبوں' محروم طبقے اور اقلیتوں کو آواز اور بصیرت دے کر عدم مساوات' بدعنوانی' لسانی کشیدگی اور انسانی حقوق جیسی خامیوں جو کئی قسم کے تصادم کی وجوہات ہیں کے علاج کا باعث بن سکتا ہے۔

اقوام متحدہ کے مقاصد میں پیشرفت کے لیے عالمی میڈیا کے ساتھ بحیثیت اعلیٰ افسر کام کرتے ہوئے مجھے اپنی اور ساتھیوں کی اس ٹاسک کی پیچیدگی سے آگاہی حاصل ہے' ہم محض ''ایک پیغام روز'' کی عیاشی کے متحمل نہیں ہوسکتے کیونکہ ہمیں ہر روز کے بعد دیگر درجنوں پیغامات ہر طرف بھیجنے ہوتے ہیں۔ ہمارے سامعین پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور مختلف مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان لوگوں کے مفادات اور جذبات کا دائرہ سرحد پار تک پھیلا ہوا ہے' ہم پرامن ماحول میں رہنے والوں اور امیروں میں غریبوں اور مسائل کا شکار افراد کے بارے میں تشویش کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم لاعلم افراد کی ضروریات کو نظرانداز نہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے باخبر طبقے کے اندر عدم اختلاف پر قابو پانے کی سعی کرتے ہیں۔ ہم جنوب کے ترقی پذیر میڈیا کو الگ تھلگ یا نظرانداز نہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے شمال کے ترقی یافتہ میڈیا کی ضروریات کا خیال رکھتے ہیں۔ ہمیں دونوں اطراف میں ہر تنازعے پر صحافیوں اور وکلاء کے ساتھ مل کر کام کرنا پڑتا ہے اور یہ سب کچھ ناہموار عالمی ماحول میں ہوتا ہے جس سے ہم بہتر مواقع اور محرومیوں دونوں کا سامنا کرتے ہیں۔

ایک لحاظ سے گلوبلائزیشن اپنی حدود اور خامیوں سے قطع نظر ایک مثبت کردار ادا کرتی ہے۔ میڈیا ہمیں ناشتے کی میز پر دنیا کے ہر کونے میں ہونے والے واقعات کی جھلک دکھاتا ہے' اب تک ہمارے رہائشی کمروں' کمپیوٹروں اور حتیٰ کہ موبائل فونوں تک میں یہ سہولت میسر آ گئی ہے۔ عالمی ابلاغ عامہ کے بارے میں اگر مجھے کوئی شبہ تھا تو بھی وہ اس وقت دور ہو گیا جب روس کے شہر سینٹ پیٹرزبرگ میں کانفرنس میں شرکت کے موقع پر ایک بدھ بھکشو میرے پاس آیا اور کہا ''میں نے آپ کو بی بی سی پر دیکھا تھا۔'' ابلاغ کی جدید ٹیکنالوجی سے دنیا سکڑ گئی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اب یہ سہولت ہر کسی کو میسر ہے' کئی لحاظ سے اطلاعات کے اس انقلاب سے دنیا میں مثبت تبدیلی آئی ہے۔ اس سے ایک ایسی کھڑکی کھلی ہے جس سے ہر طرف آباد لوگ اپنے ہمسائیوں (دیگر علاقوں) کے بارے میں بہتر آگاہی کے قابل ہوئے ہیں' یوں پہلے جو لوگ دنیا کے معاملات سے پوری طرح باخبر نہیں رہتے تھے اب ان کے لیے ایسا ممکن ہو گیا ہے۔

لیکن انقلاب فرانس کے برعکس وسیع تر آزادی کے حامل میڈیا کے انقلاب میں بعض کجیاں نظر آتی ہیں اور اس کے جڑواں گلوبلائزیشن کو ابھی بہتر نتائج بلکہ ان نتائج کے حصول کے لوازمات فراہم کرنا ابھی باقی ہے۔

چھوٹے سے ملک لکسمبرگ کے 4 لاکھ شہریوں کو افریقہ کی 7 کروڑ 60 لاکھ آبادی سے بہتر انٹرنیٹ Band width کی سہولت حاصل ہے۔ شمال اور جنوب کے درمیان تقسیم کی یہ لکیر صرف

غربت کی لکیر نہیں بلکہ فائبر آپٹک اور ہائی سپیڈ ڈیجٹل لائنوں کا بھی فرق ہے۔ اگر ڈیجٹل تقسیم ہمارے دور میں موجود ہے تو پھر اس حقیقت سے مفر ممکن نہیں۔

میڈیا بھی اس تقسیم سے مستثنیٰ نہیں' ایک طرف جہاں گلوبلائزیشن نے پوری دنیا کو ایک دوسرے کو سمجھنے کے مواقع فراہم کیے ہیں وہاں ابلاغ عامہ ابھی تک اپنے مالکان کے مفادات کی اصولی عکاسی کرتا ہے' جسے بظاہر بین الاقوامی کلچر قرار دیا جاتا ہے وہ دراصل معاشی طور پر ترقی یافتہ دنیا کا کلچر ہے۔ کبھی کبھار تیسری دنیا کی آواز بھی سننے کو ملتی ہے لیکن وہ بھی پہلی دنیا کی بولی میں ہوتی ہے۔ کانگو میں 1962ء کی بات ہے کہ صحافی ایڈورڈ بحر نے بیلجیم کی مظلوم راہباؤں کے کیمپ میں ایک ٹی وی کے نمائندے کو یہ کہتے سنا: ''آپ میں زیادتی کا شکار کون سی نن ہے جسے انگلش بھی آتی ہے؟'' گویا صرف مصیبت میں سے گزرنا کافی نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اسے صحافی کی زبان سمجھنا بھی ضروری تھا۔ کیا وہ لوگ جو گلوبلائز میڈیا میں محض اپنی ثقافتوں کی بات کرتے ہیں کیا ان کے حقیقی نمائندے ہیں؟

گلوبلائزیشن کے معنی صحیح طور پر 11 ستمبر 2001ء کو واضح ہوئے' نائن الیون کے بعد تنہائی کی طرف پسپائی' اندیشوں میں اطمینان نہیں تھا' اب یہ ممکن نہیں تھا کہ چند خوش قسمت افراد کو باقی دنیا کے مسائل سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو' اب دنیا ایک نئی اصطلاح ''گلوبل ویلج'' سے روشناس ہوئی' کیونکہ دنیا کے کسی نکڑ پر نصب خیمے میں لگی آگ دنیا کے دوسرے کونے پر ایستادہ فولادی سکائی سکریپر کو پگھلا سکتی ہے۔

بسا اوقات دہشت گردی کا جواب اجتماعیت اور رواداری کے اس ادارے کو نقصان پہنچاتا نظر آتا ہے جو دراصل جنونیوں اور قاتلوں کا بہترین متبادل پیش کرتا ہے۔ میڈیا حکومتوں کو دہشت گردوں کے خلاف لڑائی کے دوران بے گناہ شہریوں اور تارکین وطن کے حقوق کو نقصان پہنچانے کے اقدامات سے روکنے میں فعال کردار ادا کر سکتا ہے۔ اقوام متحدہ کے (سابق) سیکرٹری جنرل کوفی عنان اکثر کہا کرتے ہیں کہ جو لوگ سکیورٹی کے لیے لبرٹی (آزادی) کو نظرانداز کرتے ہیں' آخر میں دونوں سے ہاتھ دھو دیں گے۔ نائن الیون کے بعد پورے مغرب میں خاکی رنگت والے افراد کے خلاف نفرت انگیز رجحان میں کافی اضافہ دیکھنے کو ملا اور یہ تشویش ابھر کر سامنے آئی کہ اس ایشو کو میڈیا

میں نظرانداز کیا جا رہا تھا' انٹرنیشنل کونسل برائے انسانی حقوق نے 2002ء میں الزام لگایا کہ یورپ اور شمالی امریکہ کے میڈیا نے ایسے واقعات کی رپورٹنگ کا قابل ذکر اہتمام نہیں کیا تھا۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ 11 ستمبر 2001ء کے چند روز بعد جب میں نے نیویارک میں جنوبی ایشیا کے صحافیوں کی ایسوسی ایشن سے خطاب کیا تو وہاں کے منتظم نے پاکستان اور بھارت کے تارکین وطن سے پوچھا کہ کیا آپ کو رنگ وروپ کی وجہ سے امتیازی سلوک کا نشانہ بنایا گیا تو کمرے میں موجود تقریباً تمام شرکاء نے ہاتھ اٹھا کر اس کی تصدیق کی۔

لیکن میں مغربی پریس کی ان قابل احترام کوششوں کا بھی معترف ہوں جو اس نے ہنٹنگٹنی (Huntingtonian) نظریے کو مسترد کرنے کے لیے کیں' اس نظریے کے تحت تمام تر اسلامی تہذیبوں کو بلاتفریق دہشت گردی کا خطرہ قرار دیا گیا ہے۔ میں اس بات سے بہت متاثر ہوا ہوں کہ امریکی اور یورپی اخبارات اور بڑی حد تک ٹی وی چینل مسلمانوں کے مسائل کو نمایاں جگہ دیتے ہیں اور ماضی کی بہ نسبت اب مسلمان ملکوں میں ان اخبارات کے زیادہ نمائندے جو بھیجے گئے ہیں' یہ اقدام نہایت قابل تحسین ہے کیونکہ ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے ہمارا بہتر انداز میں ایک دوسرے کو جاننا ضروری ہے۔

میڈیا کو یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ تہذیبیں یکا وتنہا نہیں ہوتیں کیونکہ ہر تہذیب اپنے اندر متنوع حیثیت رکھتی ہے۔ ریاستوں کی پالیسیوں کے تعین میں مذہب اور کلچر شاید ہی کوئی کردار ادا کرتا ہو۔ اس نقطے کو سمجھنے کے لیے ہم افغانستان میں طالبان کے انداز حکمرانی پر مسلمان ممالک کے مختلف موقف دیکھ سکتے ہیں۔ درحقیقت آج ہمیں جو بین الثقافت تنازعات نظر آتے ہیں وہ کسی کلچر کی تضحیک کا نتیجہ ہیں۔ اس وقت اسلامی دنیا میں جو کچھ ہوا یا ہے اسے محض ''بنیاد پرستی' سے تعبیر کیا جاتا ہے' جو دراصل ایسی ثقافتی شناخت کے مترادف ہے۔ جس کو محدود اور مسترد سمجھا جائے' اس کا جواب ثقافتی تنوع' مقامی' قومی اور بین الاقوامی سطح پر جمہوریت کے فروغ میں مضمر ہے۔ میڈیا کا یہ پیغام عام کرنے میں نمایاں کردار ہے کہ یہ تنوع ہی ہے جو انسانی نسلوں کی عظمت کا باعث ہے اور یہی عنصر ہمیں مختلف تجربات کے حصول میں معاونت فراہم کرتا ہے' جب ہم ایک دوسرے کے مختلف عقیدے و مذہب پر یقین کے حق کو تسلیم کرنے میں ناکام ہوتے ہیں۔ ہماری انسانیت متاثر ہوتی ہے۔

محض اجنبیوں کے خلاف اندھی نفرت کے اظہار سے دہشت گردی پنپتی ہے' یہ فیکٹر دراصل تین فیکٹروں خوف' غصے اور سمجھنے کی ناکافی صلاحیت سے جنم لیتا ہے......خوف یہ کہ کوئی دوسرا آپ کے خلاف کیا کرسکتا ہے' غصہ کسی دوسرے کے اقدام پر آتا ہے اور سمجھنے کی ناکافی صلاحیت یہ ہے کہ دوسرا درحقیقت کون اور کیا ہے؟ اگر ہم دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو پھر ہمیں ان تینوں عوامل سے جہالت کے خاتمے کے ذریعے نمٹنا پڑے گا۔ ہمیں ایک دوسرے کو بہتر انداز میں جاننا ہوگا۔ یہ سیکھنا ہوگا کہ ہم خود کو ویسا ہی دیکھیں جیسا کہ دوسرے لوگ دیکھتے ہیں۔ نفرت سے آگاہی اور اس کی وجوہات جاننا بھی سیکھنا پڑے گا اور ہم ان میں سے کچھ بھی میڈیا کے بغیر نہیں کرسکتے۔

کوفی عنان نے ایک بار تجویز کیا تھا کہ میڈیا کو ''حفاظتی صحافت'' اور ''حفاظتی سفارتکاری'' کی روایت کو فروغ دینا چاہیے......اس سے مراد یہ ہے کہ کسی مقام پر بحران کے جنم لینے سے پہلے میڈیا اسے نمایاں کرے اور انسانی زندگیوں کو لاحق خطرات کو بھی قبل از وقت سامنے لانے کے اقدامات کیے جانے چاہئیں۔ اگرچہ کوفی عنان نے دوبارہ اس سوچ کا اعادہ نہیں کیا کیونکہ وہ میڈیا کو یہ ہدایت دینا مناسب نہیں سمجھتے کہ اسے کن حالات میں کیا کرنا چاہیے' لیکن یہ بات کافی معاون ثابت ہوگی اگر میڈیا سرخیوں سے آگے بڑھ کر بھی ریسرچ کرے تاکہ تصادم اور بحرانوں کی خبر وقت سے پہلے دی جاسکے اور ان کے تدارک کی حوصلہ افزائی ہوسکے۔

انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی پیشگی وارننگ جاری کرنے میں انسانی حقوق کی غیر سرکاری تنظیمیں اور میڈیا متحرک کردار ادا کرسکتی ہیں۔ اس طرح بین الاقوامی برادری کی کارروائی کے لیے سیاسی عزم کو بیدار کیا جاسکتا ہے۔ اقوام متحدہ نے منقسم معاشروں میں یگانگت' بالخصوص امن برقرار رکھنے اور امن کے قیام کے لیے میڈیا کے ساتھ قابل ذکر اشتراک کار کیا ہے۔ میڈیا مختلف ایشوز کو اس طرح فریم بھی کرسکتا ہے کہ سفارتکاروں کو متحارب فریقوں کو آپس میں بٹھانے میں سہولت ہو۔ بلقان کے خطے میں یہ میڈیا ہی تھا جس نے نسل کشی کی زبردست کوریج کرکے وہاں کے مظلوم افراد کے لیے ہمدردی کے حصول میں مدد دی' اس طرح اس کے خاتمے کے لیے عالمی دباؤ میں اضافہ ہوا۔

ترقی یافتہ ممالک کی بیشتر آبادی ٹی وی سے خبریں حاصل کرتی ہے' جس کا عمومی نعرہ یہ ہوتا ہے: ''خون سے ہی ترقی ملتی ہے۔'' ٹی وی کسی تحریر کی بہ نسبت صورتحال کی تصویر بہتر پیش کرتا ہے۔ خبر یا اچھی سٹوری کی تلاش کا عمل بسااوقات انسانی ضروریات کے منافی ثابت ہوتا ہے۔ صحافت جہاں انتہائی اہم پیشہ ہے وہاں اس میں خون آشامی کا عنصر بھی ملتا ہے۔ مشکلات' ناانصافی اور بدسلوکی کے سدباب کی بجائے اس میں اضافے کا باعث بنتا ہے' لہٰذا اس کے بغیر کوئی حقیقی تبدیلی ممکن نہیں۔ تبدیلی کے لیے آگاہی نہایت ضروری ہے اور یہی کسی صحافی کا وصف ہونا چاہیے۔ آج کی باہم انحصار پر مبنی دنیا میں غیر ملکی علاقوں میں جہالت کے دعووں کے پیچھے پناہ حاصل کرنا ممکن نہیں ہے' ہر جگہ سے متعلق خبریں' ٹی وی' اخبارات اور سب سے بڑھ کر انٹرنیٹ پر موجود ہوتی ہیں۔ دنیا میں کہیں بھی رونما ہونے والے واقعات ہمیں متاثر کرتے ہیں۔ جیسا کہ کسی نے پانی کی آلودگی کے بارے میں کہا کہ ہم سب ندی کے بہاؤ کی سمت میں رہ رہے ہیں۔ لہٰذا یہ امر بالخصوص 11 ستمبر کے بعد نہایت اہم ہے کہ ہم گہری نظر ڈالیں' تشدد سے آگے' تشدد کی وجوہات اور تہذیبوں کے بظاہر تصادم سے آگے اشتراکیت اور مکالمے کی طرف نگاہ دوڑائیں جیسا کہ سقراط نے ہمیں درس دیا تھا: ''دنیا میں صرف ایک اچھائی علم اور ایک ہی برائی جہالت ہے۔'' سرحدوں سے قطع نظر معلومات اور خیالات کے تبادلے کے ذریعے میڈیا ایک ایسی عالمگیر تہذیب کے قیام میں مدد کر سکتا ہے جہاں ہر طرف رواداری' ثقافتی تنوع کی تحسین اور بنیادی عالمگیر انسانی حقوق موجود ہوں۔

قبل ازیں اس مضمون میں میں نے میڈیا کو مشورہ دینے سے گریز کرنے کی بات کی ہے تاہم اس خواہش کا اظہار کرنا زیادہ مشکل نہیں کہ میڈیا اقلیتوں کو زیادہ وقت دینے کا عزم کرے ان کے مصائب اور محرومیوں پر توجہ دے' اس طرح نسل پرستی اور مذہبی بنیاد پرستی پر روشنی ڈالنے کا اہتمام کیا جا سکے۔ میڈیا اقلیتوں میں سے مزید صحافی اور ایڈیٹر لے سکتا ہے اور نسل پرستی کے خلاف پیغام کی مہم چلا سکتا ہے۔ عدم رواداری کا مسئلہ نہ صرف سنسر شپ سے حل کیا جا سکتا ہے اور ایک جاندار مباحثے کے ذریعے نفرت پھیلانے والوں کے خیالات کو شکست دی جا سکتی ہے۔ میڈیا کو ایسے مباحثے کی کوریج کے لیے جگہ فراہم کرنا ہوگی۔

عالمی سطح پر میڈیا کو یہ بات جاننا ہوگی کہ ہمارے اردگرد کئی ایسے معاشرے ہیں جن کی امارت ان کی سرزمین نہیں ان کی روح میں پنہاں ہے۔ایسے معاشروں کا ماضی حال کی بہ نسبت زیادہ خوشحال ہوسکتا ہے'جن کی تہذیب ٹیکنالوجی کے مقابلے میں زیادہ شاندار ہو'یہ جانتے ہوئے کہ ثقافتی امتیاز انسانی احساسات کا بنیادی وصف ہے جس کی اپنی حیثیت ہے'ایک ہی چھت کے نیچے کھانے' پینے اورسونے کا چیلنج آج میڈیا کے سامنے کھڑا ہے۔

اس چیلنج سے نمٹنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ تمام معاشروں میں ثقافتی آزادی کا تحفظ کیا جائے۔فرد کی آزادی اظہار کو بچایا جائے اور یہ کہ تمام خیالات اورفنون کی تمام اقسام کرہ ارض کی فلاح میں کردار ادا کرسکتے ہیں۔ ایک صدی پہلے میں نے کہا تھا کہ دنیا کو جمہوریت کے لیے محفوظ بنایا جانا چاہیے۔ یہ ایک اہم مقصد ہے اوراس کی اہمیت سمجھنے میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے لیکن یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں کیا جاسکتا جب تک ہم یہ نہ سمجھیں کہ یہی وقت ہے کہ ہم سب مل کر دنیا کو تنوع کے لیے محفوظ بنادیں۔



باب 8

تہذیب' انسانی حقوق اور اجتماعی ذمہ داری

سرگیئو وائرا ڈی میلو

اگر ہم عالمی تہذیب Civilization پر بحث کرنا چاہیں تو اس کے معنی چاہے کچھ بھی ہوں یہ بات اہم ہے کہ ہمیں ان افراد کو یاد کرنا ہوگا جو تہذیب کے زوال سے متاثر ہوئے۔ ہمیں ان خواتین' مردوں اور بچوں کو بھی ضرور ہدیہ پیش کرنا چاہیے جو کسی مقام پر مسلح تنازعے کا شکار ہیں۔ پرانے اعداد و شمار کے مطابق جنگ عظیم کے دوران 80 لاکھ افراد موت کا شکار ہوئے' اس جنگ کے بارے میں یہ گمان تھا اور میں بمشکل اس بات کا اضافہ کر رہا ہوں کہ اس سے تمام جنگوں کا خاتمہ ہو جائے گا' بے شمار دیگر انسان زخمی' قیدی' بے گھر یا لا پتہ ہو گئے' کروڑوں دیگر افراد اس دہشت سے خوفزدہ تھے اور یہ دہشت ایسی تہذیب کی پروردہ تھی جسے روئے زمین کی سب سے ترقی یافتہ تہذیب کہا جاتا ہے۔

پہلی جنگ عظیم کے اختتام کے بعد بین الاقوامی برادری نے عزم کیا کہ آئندہ انسانوں کی ایسی تباہی کی اجازت نہیں دی جائے گی' اس عزم میں مضائقہ کیا تھا؟ حکومتیں سر جوڑ کر بیٹھ گئیں اور لیگ آف نیشنز قائم کی گئی' اس عالمی تنظیم کے قیام کا مقصد بین الاقوامی تعلقات کا فروغ اور امن و سلامتی کا حصول تھا۔ کئی لوگ لیگ آف نیشنز کو ناکام تصور کرتے ہیں وہ اس لیے کہ یہ تنظیم دوسری جنگ عظیم روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی' جو کہ ایک ایسا تنازع تھا جو پہلی جنگ عظیم کے مقابلے میں زیادہ خوفناک ثابت ہوا۔

اس کے باوجود یہ ایک حقیقت تھی کہ اس تنظیم کے قیام کو انسانی وقار اور انسانوں کی زندگی کے تحفظ کی آگاہی اور نئی سوچ کے تناظر میں قابل ذکر سمجھا گیا' اسی طرح دنیا کے درمیان مزید

رابطوں کی ضرورت کو بھی اہم خیال کیا گیا۔ یوں اس نے اقوام متحدہ کی بنیاد رکھی اور انسانی حقوق کے بین الاقوامی تحفظ کی راہ ہموار کی۔ میرے لیے یہ امر باعث افتخار ہے کہ جس دفتر میں اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کمشنر کی حیثیت سے میں 2002ء میں متمکن ہوا اسے ''پیلس ولسن'' کہا جاتا ہے جو لیگ آف نیشنز کا گھر تھا۔

ولسنیت(Wilsonianism) ایک تصورConcept ہے جو کامیابی یا ناکامی یا پھر دونوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ مجھے اول الذکر سے قطعی اتفاق نہیں جبکہ مؤخر الذکر پر میں ضمنی طور پر متفق ہوں۔ جنگ کے بعد کی کامیابیوں کی حیثیت کی اہمیت کا غلط اندازہ لگانا ٹھیک نہیں ہوگا' امن اور سلامتی سے متعلق اداروں کی عدم موجودگی میں آج امن وسلامتی اور انسانی حقوق کے مقاصد کے حصول کے فریم ورک کی تیاری کا تصور قائم کرنا غلط ہوگا۔ یہ وہ سوال ہے جو توجہ طلب ہے اور میں اس کے جواب کی کوشش نہیں کروں گا۔ کیا آج کی دنیا میں وہ بصیرت اور صلاحیت موجود ہے جس کے تحت 1945ء میں طے کردہ مقاصد کی طرز پر نئی اقوام متحدہ قائم کی جاسکے؟ اگر آج اقوام متحدہ کا وجود نہ ہوتا تو دنیا کیسے نظر آتی؟

یہ خوش قسمتی ہے کہ واقعی ہمیں اس قسم کے سوالات کا جواب نہیں دینا پڑ رہا؟ جنگ عظیم کے بعد کے برسوں میں عالمی برادری نے مساوات' احترام' برداشت اور عدم امتیاز کے مسلمہ اصولوں پر عملدرآمد کا عزم ظاہر کیا۔ اقوام متحدہ کے عالمی اعلامیہ برائے انسانی حقوق کے ذریعے ہم نے تسلیم کیا کہ ''دنیا میں آزادی' امن اور انصاف کی بنیاد و انسانی خاندان کے تمام ارکان کے حقوق کے احترام اور مساوات پر ہے۔ خوف اور وسائل میں کمی سے آزادی ہم سب کی مشترکہ خواہش ہے۔ اور ہم نے اتفاق رائے سے یک زبان ہوکر تسلیم کیا کہ ''ہم سب آنے والی نسلوں کو جنگ و جدل کے سائے سے بچانے کا عہد کرتے ہیں۔'' لہٰذا انہی اقدار اور مقاصد کے تحت ہم نے انسانی حقوق کے بین الاقوامی معیارات وضع کیے' تاہم ان معیارات کو برقرار رکھنے کے لیے ہم اپنے فرائض ادا کرنے میں ابھی تک ناکام ہیں۔ اکثر ہم ان لوگوں کو نظرانداز کرتے ہیں جو تشدد' عدم مساوات' عدم رواداری اور امتیازی سلوک کے باعث بامقصد انداز میں زندگی گزارنے سے قاصر ہیں' اس سے بھی بدتر یہ کہ: یہ لوگ مسلط کی گئی مصیبت در مصیبت کا شکار ہیں۔

تہذیب کیا ہے؟

ان مشاہدات کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تہذیب Civilization ایک ایسا تصور ہے جس کی تعریف Definition ہونا ابھی باقی ہے۔ یہ بھی ایک مسئلہ ہے کہ میں نے اس کے باوجود مضمون میں بارہا یہ لفظ استعمال کیا ہے'اس بات کا خدشہ موجود ہے کہ یہ تعریف تصوراتی'عنوانی یا نامکمل یا ان تینوں کا کوئی مجموعہ ہو' میں تو ذاتی طور پر''عالمی تہذیب'' کی تعریف کرنے سے بھی خائف ہوں' جو عالمی سطح پر اتحاد کے تصور کی گھنٹی بجاتی ہے۔سب سے پہلے موزوں ترین یہ ہے کہ ہم کو انسانیت کے نقطے سے متفق ہوکر اختلاف کا حل نکالنا چاہیے۔ دوم یہ کہ ہمیں انسانی وقار کے مشترکہ تصور پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے اور یہ عنصر ایک عالمی تہذیب کے تصور سے زیادہ ثمر آور ثابت ہوسکتا ہے۔

تہذیب کی اطمینان بخش تعریف تک پہنچتے ہوئے'ہمیں تصویر کو دھندلا نہیں ہونے دینا چاہیے۔ میں جانتا ہوں مہذب ہونا کیا ہوتا ہے' میں نے اسے دیکھا ہے اور ہم سب اسے جانتے ہیں۔اقوام متحدہ میں خدمات سرانجام دیتے ہوئے میں نے زیادہ عرصہ پرامن اور ترقی یافتہ ملکوں میں گزارا اور ہم اسے فیلڈ میں کام کرنا کہتے ہیں۔اس دوران میں نے ایک دوسرے کو پیشکش کرنے کے حوالے سے انتہائی اچھا اور انتہائی برا دونوں پہلو دیکھے ہیں'ایسا رویہ ہر جگہ پایا جاتا ہے۔

اقوام متحدہ کے کارکن کی حیثیت سے میں ذرا توقف کرکے حیران ہوتا ہوں کہ انسانی زندگی کی اس بے توقیری کے باوجود مختلف معاشرے کیسے ترقی کر سکتے ہیں' ''تہذیب'' کے مشترکہ تصورات دراصل مثبت پہلو کے حامل ہیں'جن میں عام طور پر بعض نوعیت کے ثقافتی اشتراک اور اخلاقی پہلو دونوں ملتے ہیں۔اس کے علاوہ فنون' کلچر' آگاہی اور شائستگی کے عناصر ہیں' ان میں غیر حیاتیاتی طرز پر ارتقاء اور سماجی ترقی میں پیشرفت کے اجزاء شامل ہیں۔

میرے نقطہ نظر میں ''تہذیب'' کی اصطلاح بعض پہلوؤں سے منفی تصورات کی حامل ہے'ان تصورات میں ثقافتی احساس' برتری'اشرافیت' سامراجیت اور مغربی آئیڈیلزم شامل ہیں'اگر کوئی خود کو مہذب خیال کرتا ہے تو اس کے نزدیک دیگر مختلف لوگ غیر مہذب ہوں گے۔

درحقیقت' چند برس پہلے کی بات ہے کہ یہ تجویز پیش کی گئی چونکہ مغربی تصورات برتر ہیں اور انہیں ہر جگہ تسلیم کیا گیا ہے اور یہ کہ اس وقت دنیا اس لحاظ سے تاریخ کے انجام کا مشاہدہ کررہی ہے

کہ اب تہذیبوں کے تصادم کو ہوا دینے والا کوئی عنصر اب موجود نہیں' اب اس قسم کا تصور پیش کرنے کی موجودہ حالات میں کون جرأت کرسکتا ہے؟ چلیے یہ بھول جاتے ہیں کہ پوری تاریخ میں ظلم وجبر کا جواز دینے کیلیے دنیا نے ''تہذیب'' کے لفظ کو نظرانداز کیے رکھا اور یہی صورتحال توسیع پسندی' سوچ' رویوں' نوآبادیاتی نظام اور براعظم امریکہ میں غلامی اور نسل کشی کے حوالے سے اختیار کی گئی' یہ اقدامات کرتے ہوئے ان تہذیبوں کی دلیل یہ تھی کہ وہ دراصل تہذیب کے مشن پر تھے' عالمی تہذیب کی جس بحث سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں اس میں ان پہلوؤں کو ذہن نشین رکھنا ہوگا۔

شاید کچھ لوگ یہ موقف اختیار کرسکتے ہیں کہ موجودہ نئی ہزاری Millennium کے آغاز پہ ہم نے عالمی تہذیب کی منزل پالی ہے.....یعنی عالمی سطح پر سماجی ترقی میں انتہائی بہتری آئی ہے اور اب ہیگل کے Weltgeist نظریے کے تحت عالمی روح کا حصول ممکن ہوا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم جس دور میں رہ رہے ہیں اس میں جتنی دولت' ٹیکنالوجی' تعلیمی اور سائنسی ترقی نظر آتی ہے اس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی۔ اس وقت دنیا پہلے سے کہیں زیادہ جمہوری ہے۔ 140 ملکوں میں اب کثیرالجماعتی انتخابات ہوتے ہیں' ملکوں کے درمیان جنگوں اور ان جنگوں میں انسانی جانوں کے ضیاع کی تعداد میں قابل ذکر کمی آئی ہے۔

گلوبلائزیشن' غربت اور اجتماعی امتیاز

نئی ٹیکنالوجی کے نتیجے میں عالمی منڈیاں کھل گئی ہیں اور معاشی رابطوں میں اضافے کے باعث مواقع بڑھ گئے ہیں۔ گلوبلائزیشن کی وجہ سے وسیع تر مواصلات اور مختلف ثقافتوں کے تبادلے کی رفتار میں اضافہ ہوا ہے' ایسا کرتے ہوئے عظیم تر انسانی آزادی کا راستہ ہموار ہوا ہے' لیکن ان مثبت تبدیلیوں کے باوجود سرد جنگ کے خاتمے کو بعض لوگ ماضی کی یاد Nostalgia کے طور پر یاد رکھتے ہیں اور گلوبلائزیشن کے جاری عمل سے کئی بے یقینیوں نے بھی سر اٹھایا ہے۔

دہشت گردی کی نئی اقسام ابھر کر سامنے آئی ہیں جن سے نیویارک' جزائر بالی اور ماسکو میں بے پناہ نقصان اٹھانا پڑا' دہشت گردی کے انسانی ضیاع کا احساس فلپائن' مشرق وسطیٰ' الجزائر اور سری لنکا میں اسی طرح پایا جاتا ہے جس طرح کچھ عرصہ قبل مغربی یورپ میں ملتا تھا۔ کئی ملکوں میں اب بھی اندرونی مسلح تصادم کے کئی واقعات دیکھنے کو ملتے ہیں۔

اسی طرح غربت، ایڈز،نسل پرستی اور منفی امتیاز بڑے پیمانے پر دنیا میں انسانی مصائب میں اضافہ کر رہا ہے۔اس سے افراد اور مختلف برادریوں کی محرومی میں اضافہ ہوا اور وہاں کشیدگی پیدا ہوئی جبکہ انسانی ترقی کا عمل متاثر ہوا۔ عدم تحفظ کا خطرہ اس کے علاوہ ہے،اس میں سے ہر عنصر تہذیب کو نقصان پہنچانے کا باعث بنا ہے۔

اگرچہ بین الاقوامی جنگوں کی تعداد میں کمی آئی ہے لیکن بین الاقوامی تنازعات میں ایک دہائی کے دوران 30 لاکھ 60 ہزار افراد موت کا شکار ہوئے ہیں۔ زیادہ پریشان کن امر یہ ہے کہ ان تصادموں میں شہریوں کو زیادہ نشانہ بنایا گیا۔مرنے والے ان ساڑھے 30 لاکھ سے زائد افراد میں سے 90 فیصد شہری تھے جو سرد جنگ کے بعد تنازعات میں ہلاک یا زخمی ہوئے اور ان میں سے نصف تعداد بچوں کی تھی، پناہ گزینوں اور مہاجرین کی تعداد میں بھی انتہائی تیزی سے اضافہ ہوا،اس طرح ان تنازعات میں غیر مسلح افراد کے متاثر ہونے میں شدت دکھائی دیتی ہے۔

یہ صورتحال پریشان کن ہے۔مغربی یورپ سمیت کئی مقامات پر صیہونیت اور اسی طرح اسلام کے خلاف جذبات میں نیا اضافہ ہوا ہے۔ یہ پہلو تہذیب کے سوال پر سوچ بچار کرنے والوں کے لیے فکرانگیز ہے اور اس کے محرکات میں سب سے بڑی برائی عدم رواداری کی ہے،جو کئی واقعات کے پیچھے چھپی ہوئی ہے۔انسانی حقوق کا تحفظ ہر ریاست کی پہلی اور ترجیحی ذمہ داری ہے،اس کے باوجود حکومتیں عدم برداشت کے حالیہ نظریات سے نمٹنے میں سستی کی مرتکب ہوئی ہیں۔

گزشتہ ایک عشرے یا زائد عرصے کے دوران جتنی بھی سیاسی، سماجی اور معاشی تبدیلیاں عمل میں آئیں ان سے بالخصوص خواتین پر منفی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔کسی تصادم یا نقل مکانی کے نتیجے میں خواتین المناک نتائج کا شکار ہوئیں اور ان کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا،معاشی عدم استحکام اور تبدیلی سے منفی مساوات کے مقصد پر بری طرح زد پڑتی ہے،اس میں بالخصوص غربت کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔خواتین کے خلاف ادارہ جاتی امتیاز اور روایتی منفی تفریق ہر معاشرے میں نظر آتی ہے۔

یہ صورتحال محض خواتین کے بنیادی حقوق سے مفر کے باعث قابل قبول نہیں بلکہ ایک لحاظ سے یہ ہم سب کو مجموعی طور پر نظرانداز کرنے کے مترادف ہے۔خواتین امن کے لیے ایک قوت ہیں،وہ

ایک ایسا دھاگا ہیں جس سے خاندان باہم بندھے ہوئے ہیں۔ یہ مصالحت کی علامت ہیں' خواتین اکثر مقامات پر معاشی کردار کی حامل ہیں اور آبادی کے لحاظ سے اکثریت میں ہیں' معاشرے کی اتنی بڑی اور مؤثر تعداد کو خاموش کرانا کوئی معنی نہیں رکھتا اور معاشروں کی تشکیل میں ان کے جاندار کردار کے آگے رکاوٹ ڈالنے کا بھی کوئی جواز نہیں۔

یہ مسائل بنیادی طور پر نئے نہیں ہیں' صدیوں سے انسان جنگ' بیماری اور عدم مساوات سے لڑتا آ رہا ہے۔ نئی چیز یہ ہے کہ ہمارے پاس آج دنیا میں امارات اور نیت' طاقتور اور کمزور کی تقسیم سے ناشناسی کا کوئی بہانہ نہیں' ہمارا یہ استدلال قطعی منصفانہ نہیں کہ یہ تقسیم غریبوں پر مسلط کی گئی ہے اور اس کے ساتھ یہ دعویٰ کریں کہ ہم مہذب ہیں۔

تکلیف دہ امر یہ ہے کہ معاشرے کے ان متاثرہ طبقوں کی تشفی کا رجحان بہت کم نظر آتا ہے' معاشروں کو متاثر کرنے والی پالیسیوں کے ناقدانہ تجزیے کی کوشش بہت کم کی جاتی ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ مجھے شبہ ہے کہ ہم اس کے اثرات کے ادراک کی صلاحیت کے معترف نہیں۔ خطرہ یہ اخذ کرنے میں ہے کہ نام نہاد عالمی برادری ''مہذب'' ہے اور یہ ایسی بے حسی ہے جس کے ہم عادی ہو چکے ہیں۔

انسانی حقوق کی عالمگیریت

یہ صورتحال جاری نہیں رہ سکتی' ہم صرف اس بات کے متحمل نہیں ہو سکتے کہ صرف اپنی مخصوص برادری کے معاملات کے بارے میں متفکر ہوں' اس کے علاوہ صرف اپنے ہمسائے' شہر یا ملک کے اندر اظہار یکجہتی سے کام نہیں چلے گا' بلکہ ہمیں پوری انسانیت کے بارے میں احساس کی پرورش کرنا ہوگی' ہمیں ایسے حالات پیدا کرنا ہوں گے جن میں ہم قومیت' جنس' نسل اور معاشی حیثیت سے قطع نظر تعاون اور یکجہتی کے ثمرات سے مستفید ہوسکیں۔ ہمیں گلوبلائزیشن کی طاقت کو متحدہ قوت میں تبدیل کرنا چاہیے' ایک ایسی گلوبلائزیشن جو انسانی حقوق کو اس کی روح کے مطابق فروغ دینے میں معاون ہو۔

انسانی حقوق کو آج حقیقت میں زبردست کردار ادا کرنا ہے' دنیا کی تہذیب کی جگہ مہذب دنیا کی تشکیل کی بنیاد کے قریب ترین تصورات میں انسانی حقوق کی غیر منقسم حیثیت اور عالمگیریت

ناگزیر ہیں۔سماجی' سیاسی اور معاشی اصولوں کی شمولیت کی بنیاد حقوق اور ذمہ داریوں پر قائم ہے ۔ مقتدر اور مراعات یافتہ طبقہ تاہم حقوق اور ذمہ داریوں کو اکثر اپنے مفادات کے لیے خطرہ سمجھتا ہے۔ عالمی سطح پر تمام افراد کے لیے مسلمہ اقدار اور اصولوں کو تمام قوموں کی ترقی اور استحکام کا ہتھیار سمجھنا چاہیے۔

اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر کی حیثیت سے قانون کی حکمرانی میرے فرائض کا جزو لاینفک ہوگا' قانون کی حکمرانی پر انسانی حقوق کے تحفظ کا مدار ہے اس کے بغیر ہمارے وقار کا احترام اور انسانوں کی مساوات اور تحفظ کا تصور بے معنی ہوگا۔دیگر الفاظ میں انسانی حقوق کا مطلب محض اخلاقی یا سیاسی نہیں ہوتا بلکہ اس کا محور ذمہ داریوں' قانونی فرائض اور احتساب کے گرد گھومتا ہے۔ قانون کی حکمرانی کے فریم ورک کے ذریعے انسانی حقوق افراد کو ایسے معاملات پر فیصلے کے قابل بناتا ہے جوان کی زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔اس کے علاوہ انہیں وہ ذرائع حاصل کرنے میں مدد دیتے ہیں جس کے تحت نقصان دہ اثرات کا راستہ روکا جاسکتا ہے۔

حقوق کا مقصد افراد کو بااختیار بنانا ہوتا ہے تاکہ ہم انہیں ایکشن کے آلے کے طور پر استعمال کرسکیں'ان حقوق سے ہماری آوازیں قانونی حیثیت اختیار کرتی ہیں اور افراد کی فیصلہ سازی کے عمل میں شرکت کی راہ ہموار ہوتی ہے۔حقوق کے ہم سب پر برابری کے نفاذ سے امتیازی سلوک کا راستہ روکا جاتا ہے۔

انسانی ترقی کا عمل صرف وہیں مہمیز ہوتا ہے جہاں لوگ اسے فیصلے کرنے میں آزاد ہوتے ہیں جوان کی زندگی کو سانچے میں ڈھالتے ہیں۔عوام کی وہ آزادانہ خواہش جوان کی سیاسی' معاشی' سماجی اور ثقافتی نظم کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے'میرے نزدیک انتہائی اہم ہے۔مختصر یہ کہ موروثی تہذیب ہے۔

جمہوری گورننس کی بنیاد شہری اور سیاسی حقوق پر استوار ہوتی ہے'بالخصوص سیاسی زندگی میں شمولیت کا حق' کسی تنظیم یا سیاسی آرڈر کا بنیادی نکتہ ہر انسان کی برابری کی سطح پر عزت تسلیم کرنے کے اصول میں مضمر ہے۔ جمہوریت انسانی حقوق کے ادراک کا موزوں ترین فریم ورک مہیا کرتی ہے'اس طرح جمہوریت سیاسی فیصلہ سازی میں آواز اٹھانے کے مواقع فراہم کرتی ہے اور یہ ایک ایسا آلہ ہے جو ہمیں دوسروں کے حقوق کی شناخت جاننے کے قابل بناتا ہے۔

میں یہ نہیں کہہ رہا کہ جمہوریت تمام مسائل کا حل ہے، جمہوریت سے وابستہ معاملات کو جانچنا اور ان کو حل کرنا اہم بات ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جمہوریت خود بخود انسانی حقوق سے منسلک ہوجاتی ہے، نہ ہی اس کی موجودگی معاشی اور سماجی ترقی کا ضامن ہے۔ جمہوری ملکوں کی ایک بڑی تعداد میں شہری اور سیاسی حقوق کا فقدان ہے اور دیگر کئی معاشی اور سماجی حقوق کو نظرانداز کر رہے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ نظرانداز کرنے کی اس کیفیت کو اس لیے درخواعتنا نہیں سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس سے مقتدر طبقے کے لیے انتخابی نتائج پر بہت کم فرق پڑتا ہے۔

انتقال اقتدار کے عمل سے گزرنے والے ممالک کو بالخصوص ان چیلنجوں کا سامنا ہوتا ہے، کیونکہ مطلق العنان حکومت کی جگہ جمہوری حکومت کے قیام سے انسانی حقوق کے مسائل حل نہیں ہوتے بلکہ اس کے برعکس ان مسائل کی پیچیدگی بڑھتی ہے۔ اس کے لیے آپ جنوبی افریقہ، مشرقی تیمور، سیرالیون اور افغانستان کی مثالیں لے لیجئے، وہاں ماضی میں ہونے والی بدامنی کے بعد اب بھی امن عامہ کا قیام نہیں ہوسکا ہے۔

جمہوریت کو کئی اور قسم کی کمزوریوں کا بھی سامان کرنا پڑتا ہے، اس میں کسی فرد کو چار سال یا اس کے بعد ایک دن چوائس ملتی ہے، اکثریت کو مطلق العنان حیثیت مل سکتی ہے اور وہ کئی طرح سے اقلیتوں کے حقوق غصب کرسکتی ہے۔ اکثریت اقلیت کو عملی معاملات سے الگ کرسکتی ہے، میڈیا اور سیاسی حقوق کو من مرضی سے استعمال کیا جاسکتا ہے، اقلیتوں کے حقوق کی قیمت پر قانون کی حکمرانی کو معطل کیا جاسکتا ہے۔ اقلیتوں کی ثقافتی، لسانی اور مذہبی روایات کو دبایا جاسکتا ہے اور اکثریت کے مفادات کے لیے اکثریت کے معاشی مفادات کو نقصان پہنچایا جاسکتا ہے، ایسی بدعتیں اکثر جمہورتوں کو اندر سے نقصان پہنچاتی ہیں، ہمیں ان خدشات سے خبردار رہنا چاہیے۔

اس کے ساتھ ساتھ ہمیں ایسے کئی معاشروں کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے جہاں اقلیت کی بہ نسبت اکثریت کو محروم رکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مردوں، کمسن افراد اور غریب طبقے کو لے لیجئے۔ یہ اخذ کرنا مناسب نہیں ہوگا کہ انسانی حقوق کا مکمل تحفظ، جمہوریت یا قانون کی حکمرانی کسی معاشرے کے زوال کو بچا سکتے ہیں، انسانی حقوق کے احترام پر استوار شہری ضابطہ Civic order یہ کہتا ہے کہ حکام افراد کے حقوق کا احترام کریں۔ انسانی حقوق کا تحفظ اور فروغ

حکومتوں کی اولین ذمہ داری ہوتی ہے لیکن شہری ضابطہ اس بات کا بھی متقاضی ہوتا ہے کہ شہری ایک دوسرے کے لیے اپنی ذمہ داریاں محسوس کریں۔

نچلی سطح سے گلوبل ازم اور کارپوریٹ شہریت

اس تناظر میں مجھے یہ موقع ملا ہے کہ میں ایک نئی قسم کے شہریت کے تصور پر روشنی ڈالوں اگر شہریت کی تعریف کسی ملک کے ارکان کے حقوق اور فرائض سے عبارت ہے تو وہ سیاسی طور میں کمپنیوں پر بھی یہی حقوق و فرائض لاگو ہوتے ہیں' یوں کارپوریشنوں کی کارکردگی مما لک سے مماثل ہوتی ہے کیونکہ دونوں افراد کے مفادات کی نمائندگی کرتے ہیں۔

2000ء میں اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری کوفی عنان نے گلوبل Compact کا اجراء کیا' جس کے پہلے آرٹیکل میں انہوں نے کاروباری کمپنیوں سے کہا کہ وہ اپنے اپنے حلقہ اثر میں انسانی حقوق کے تحفظ کے احترام کی حمایت کریں۔ اس ضمن میں کمپنیوں کی کارکردگی مختلف ہوتی ہے' لیکن شہریت کے معانی پر غور کرنے سے ہمیں ایک دوسرے کے حقوق کے خیال کا موقع ملتا ہے۔

میں ایک ایسے ملک (برازیل) سے تعلق رکھتا ہوں جو اعلیٰ ثقافتی تنوع کے حوالے سے کافی مشہور ہے۔ یہ ایک ایسا ملک ہے جس نے عشروں بلکہ صدیوں سے ترقیاتی پالیسیوں پر عمل درآمد کیا ہے' ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اس سے یہاں کے اصل باشندوں کو محرومی کا بھی نشانہ بننا پڑا۔ اگر ہم حالیہ برسوں پر نظر دوڑائیں تو ہم کچھ ایمانداری سے کہہ سکتے ہیں کہ آج کا کارپوریٹ برازیل...... بشمول بین الاقوامی کمپنیاں...... نہ صرف برازیل کے قدرتی جنگلات بلکہ وہاں صدیوں سے مقیم آبادی کی تباہی کا باعث بن رہا ہے۔ برازیل نے مادی طور پر تو کافی ترقی کی ہے لیکن اس کی قیمت قدیم مقامی افراد کی بربادی کی صورت میں ادا کرنا پڑی۔

مقامی افراد کے لیے کارپوریٹ سیکٹر ٹیکنالوجی' لامحدود دولت اور قانونی مہارت کے تناظر میں نئے چیلنج پیش کر رہا ہے۔ یہ امر اتنا آسان نہیں کہ ایسا توازن تلاش کیا جائے جو مقامی باشندوں کے حقوق کا تحفظ اس طرح کرے جس طرح حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ شہریوں کے حقوق کی محافظ کا کردار ادا کرے' تاہم اس کے لیے کچھ چیزیں درکار ہیں' شفاف قواعد نہایت اہم ہیں' فوائد میں

شراکت نہایت اہم ہے۔اسی طرح متاثرہ طبقوں کی پیشگی رضامندی لینا بھی بہت ضروری ہے' تہذیب کے بارے میں میرا جو نظریہ ہے اس میں مقامی افراد اور ان کے مختلف کلچروں کو شامل کرنا بھی ضروری ہے۔

کارپوریٹ اور سرکاری ذمہ داریوں کا ایک اور پہلو بھی ہے۔اگرچہ کارپوریشنیں اپنے تصوراتی فریم ورک برائے شہریت کے ذریعے مخصوص ذمہ داریوں کے لحاظ سے عالمی سطح کی کردار ہیں اور ان کا ایک خاص حلقہ اثر ہے لیکن اس کے ساتھ افراد مقامی تشویش کی بجائے عالمی سطح کے معاملات کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ احساس پایا جاتا ہے کہ ہم عالمی برادری کا حصہ نہیں اور ہمارے افعال کا اثر دیگر خطوں کے افراد پر بھی پڑے گا'اگرچہ اس ضمن میں عالمی سطح پر حل ضروری نہیں لیکن سرحدوں کے آر پار یہ تعلق مشترکہ احساس ذمہ داری ضرور پیدا کر رہا ہے'لہٰذا نچلی سطح سے گلوبلائزیشن کا یہ عمل عالمی تہذیب کے لیے صحت مندانہ رجحان ہے'یوں عالمگیریت کا یہ تصور خوش امیدی کی بعض وجوہات بھی فراہم کرتا ہے۔

اعلیٰ تہذیب کی سمت میں

عالمی تہذیب کی بات کرتے ہوئے شاید ہم کچھ غلط اندازوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔مہذب ریاست کے قیام' بشرطیکہ ریاست کی تعریف ممکن ہونے کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہم انسانی وقار کی عالمگیریت کو واضح کرتے ہوئے اس کی بہتر تحسین کریں اور میرے نزدیک یہ تحقیق کا ایک نہایت مفید راستہ ہے۔

انسانی حقوق اس نوعیت کی تحقیق کا بہترین روڈ میپ فراہم کرتے ہیں۔اقوام متحدہ کا چارٹر اور گزشتہ نصف صدی میں منظور کیے گئے انسانی حقوق کے دیگر معاہدے عالمی ضابطہ اخلاق کے قریب ترین ہیں۔ یہ مشترکہ انسانیت کی تشکیل کے لیے عمارت کے بنیادی اجزا ہیں اور اس کے لیے درکار عزم رضاکارانہ ہے جس کی بنیاد رواداری اور احترام آدمیت پر قائم ہے۔ یہ سب کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ ان کی عزت کی جا رہی ہے۔

انسانی حقوق سے کئی اضافی فائدے بھی ہوتے ہیں جن کا ہمیں ادراک ہونا چاہیے۔اول یہ کہ انہیں سمجھنا آسان ہے اس کے لیے ہمیں لمبی بحثوں کی ضرورت نہیں۔کیونکہ ان کے نتائج اکثر مبہم

ہوتے ہیں جس سے حق کے سوال کا جواب بہرحال نہیں ملتا۔ متاثرہ افراد کو یہ سمجھنے میں کوئی مشکل نہیں کہ کون سا اور کیسے حق چھینا جا رہا ہے۔ اس حوالے سے تعریفوں Definitions کا بھی کردار ہے جو انہیں ادا کرنا ہے۔

دوم یہ کہ انسانی حقوق ہمیں آگے جانے کے لیے ناکامیوں کے اثرات زائل کرتے ہیں۔ ریاستوں اور غیر سرکاری اداروں کا یہ فرض ہے کہ وہ انسانی حقوق کا تحفظ یقینی بنائیں۔ انسانی حقوق سب کے لیے ہوتے ہیں اور اس بات کو بھی یقینی بنایا جانا چاہیے کہ ان میں تنوع کی بھی راہ ہموار ہے' انسانی حقوق کا احترام میرا بنیادی پیغام ہے۔

مختلف ثقافتوں اور افراد کو باہم تعاون پر آمادہ کرنا آج کی اولین ترجیح ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس میں بھی ایک اتحاد ہے' ہمارے سامنے اہم ٹاسک یہ ہے کہ ہم اس اتحاد میں مضمر عظیم سچ کو تلاش کریں' اور تجربات میں تصادم اور اعادے سے بچنے کے لیے صحتمندانہ کردار ادا کریں' شاید یہی تہذیب کی اصل روح ہے۔



باب9

بے انتہا دشمن یا انسانی سلامتی

جوڈی ولیمز

سوویت یونین کے زوال کے بعد کئی لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا ہوگئے کہ اب دنیا کے تبدیل ہونے کے امکانات ہیں، یہ امید کی گئی کہ دنیا اب چونکہ دو متضاد کیمپوں میں تقسیم نہیں رہی تو فوجوں کی تعداد اور فوجی بجٹ میں کمی ہوسکتی ہے۔اس مغالطے کی وجہ یہ تھی کہ عالمی سطح پر اس کمی اور شاید اسلحے کی تجارت میں ڈرامائی کے نتیجے میں امن کا دور دورہ ہوگا اور یہ وسائل بنی نوع انسانی کو درپیش مسائل کے حل کے لیے استعمال کیے جائیں گے۔

کچھ دیگر افراد کا نقطہ نظر زیادہ حقیقت پسندانہ تھا اور انہوں نے محسوس کر لیا کہ تبدیل شدہ اور تبدیل ہوتی دنیا کے بارے میں مربوط اور منظم اپروچ اختیار نہ کی گئی تو حقیقی تبدیلی حاصل کرنا مشکل ہوگا۔اب جبکہ دنیا کی واحد سپر پاور (امریکہ) کو کمیونسٹ خطرے کا مزید سامنا نہیں رہا تھا تو بعض لوگوں کو تشویش لاحق ہوئی کہ اب اس یک قطبی دنیا میں اس کا ردعمل کیا ہوگا؟ کئی افراد نے قیاس آرائی کی کہ یہ واحد سپر طاقت اب نئے دشمن بناسکتی ہے تاکہ حقیقی خطرات بدستور برقرار رہیں اور عسکریت پسندیMilitarism کا جواز فراہم کیا جاسکے، یوں یہ طاقت سرد جنگ کے بعد کے ماحول میں اپنی فوجی، معاشی، اور ٹیکنالوجی کے لحاظ سے برتری ثابت کر سکے۔اس سے پہلے کہ نئی دنیا تازہ صورتحال میں مکالمہ شروع کرنے پر غور شروع کرتی عراق نے کویت پر چڑھائی کر دی۔جس کے بعد 1991ء میں پہلی جنگ خلیج شروع ہوگئی، مجھے یاد ہے کہ اس وقت میں نے اس حیرت کا اظہار کیا تھا کہ یہ تصادم عربوں یا مسلمانوں میں یہ سوچ پیدا کرنے کا باعث بنے گا کہ اب کیا کوئی نیا ''دشمن'' تیار کیا جا رہا ہے۔اس جنگ کے محدود وقت میں خاتمے اور عراقی فوج کو کویت سے پیچھے

دھکیلنے جبکہ صدام حکومت کا تختہ نہ الٹنے سے کچھ امید پیدا ہوئی' اس جنگ کے کچھ عرصے بعد واشنگٹن میں نئی انتظامیہ نے اقتدار سنبھالا جس نے اسرائیل فلسطین کے مسئلے کے حل کے لیے سنجیدہ کوششیں شروع کیں اور سرد جنگ کے بعد کی دنیا کے بارے میں امیدوں کو تقویت ملنے کا سلسلہ جاری رہا۔

بلند توقعات کی اس بظاہر چھوٹی کھڑکی سے عالمی سطح کے کئی مسائل کے مشترکہ حل کے لیے نئے اقدامات کے دلیرانہ کی امیدیں وابستہ کی گئیں' ان میں سے ایک بارودی سرنگوں پر پابندی کی عالمی تحریک تھی' یہ اقدام محض اس لحاظ سے اہم نہیں تھا کہ اس سے تاریخ میں پہلی بار اس غیر روایتی ہتھیار کے خاتمے کی راہ ہموار ہوئی جو گزشتہ 100 برسوں سے تقریباً تمام لڑاکا فوجوں کے زیر استعمال رہا بلکہ اس سے حکومت......سول سوسائٹی......اور بین الاقوامی ادارہ جاتی پارٹنرشپ کا نیا نمونہ بھی میسر آیا جس سے یہ ثابت ہوا کہ مشترکہ مسائل کے حل کے لیے کس طرح عالمی برادری مل جل کر کام کر سکتی ہے؟ اس قسم کے دیگر اقدامات کی ایک دیگر مثالوں میں انٹرنیشنل کریمنل کورٹ کا قیام اور بچوں کو فوج میں بھرتی کرنے کی روک تھام کی کوششیں شامل ہیں۔ان کوششوں سے ایک ایسی تحریک کی روح ابھری جس میں نہ صرف ہتھیاروں کی تیاری' پیداوار اور تجارت کے ذریعے عالمی سلامتی کی صورتحال میں بہتری لانے بلکہ انسانی سلامتی کو بنیادی اہمیت دینے کی بات کی گئی اور مؤخرالذکر پر ہی تمام سلامتی کا دارومدار ہے۔ انسانی سلامتی کا تصور یہ ہے کہ کرہ ارض پر اکثریت کی بنیادی ضروریات پوری کرنے اور انہیں ان کے مستقبل کی امید دینے سے تصادم کی جڑ وجوہات کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔مکالمے' دیگر ثقافتوں سے مفاہمت اور تصادم کے حل سے انسانی سلامتی میں اضافہ ہوتا ہے۔ طاقت کا استعمال حقیقی حل نہیں ہوتا بلکہ یہ دراصل آخری آپشن سمجھا جاتا ہے جو دیگر تمام آپشنوں میں ناکامی کے بعد استعمال کیا جانا چاہیے۔

نیا عالمگیر دشمن

جس وقت اس قسم کی سوچ فروغ پا رہی تھی اسی لمحے پرانی طرز پر عملدرآمد کا دباؤ بھی بڑھ رہا تھا۔ایک ملک کے دوسرے ملک سے تعلقات کار کے پرانے نظام پر زور دینے اور عالمی مسائل کے حل کے لیے نئے کرداروں کے وجود کو یکسر مسترد کرنے کی بات کی گئی۔فوجی صلاحیت کے بغیر چھوٹی

طاقتوں......غیر متعلقہ کہہ لیجیے......کی طرف سے انسانی سلامتی کے ایجنڈے کو سرمو اہمیت نہ دینے کا معاملہ بھی سامنے آیا۔اس قسم کے عناصر کا مؤقف تھا کہ قومی سلامتی کے معاملات اتنے پیچیدہ ہیں کہ انہیں سویلین شاید ہی سمجھ سکتے ہوں لہٰذا ہمیں تن تنہا ہی آواز بلند کرنی چاہیے۔

اس تناظر میں القاعدہ نیٹ ورک ایک ٹھوس خطرے کے طور پر سامنے آئی اور 1993ء میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر پہلا حملہ کیا گیا۔1996ء میں سعودی عرب کے خبیر ٹاور میں مقیم امریکی فوجیوں کو نشانہ بنایا گیا‘ 1998ء میں کینیا اور تنزانیہ میں امریکی سفارتخانوں پر حملے کیے گئے اور 2000ء میں یمن کے ساحل پر ایندھن کے لیے لنگر انداز امریکی بحری جہاز یو ایس ایس کول کو نشانہ بنایا گیا۔ان تمام دہشت گردانہ حملوں کا مقصد مشرق وسطیٰ کو مغربی غلبے سے آزاد کرانے کے سیاسی مقاصد کی سمت میں پیشرفت کرنا تھا‘ دہشت گردی کا ہولناک مظاہرہ اس وقت ہوا جب 11 ستمبر کو نیویارک اور واشنگٹن میں حملے کیے گئے۔

ان حملوں کے فوری بعد جذباتی اور اشتعال آمیز پیغام میں جب صدر بش نے صلیبی جنگ Crusade مسلط کرنے کا اعلان کیا تو یہ بات بالکل واضح کر دی گئی کہ ''ہم ان کے خلاف ہیں'' اور یہ بھی واضح کیا گیا کہ ''وہ'' کون ہیں‘ پھر جب عوامی احتجاج کے دوران یہ کہا گیا کہ نیا دشمن عرب اور اسلامی عقیدے کے حامل ہیں تو اس نئی ''بدی'' سے نمٹنے کے اقدامات واضح نہیں کیے گئے‘ اس دوران اسرائیل نے دوسری تحریک مزاحمت (انتفاضہ) کے پیش نظر مقبوضہ فلسطینی علاقوں میں حفاظتی دیوار کھڑی کی تو یہ اس عالمی دشمن کے سامنے دیوار کھڑی کرنے کا عملی اظہار تھا اور یہ عالمی دشمن اسلامی دہشت گردی کا نیٹ ورک تھا۔ کچھ دشمنوں کو واضح مخالف سمجھا گیا جو اپنی سرزمین کا دفاع کر رہے تھے یا اس کی خواہش رکھتے تھے‘ دیگر کو اس سے بھی خطرناک دشمن سمجھا گیا جو پوری دنیا میں خفیہ تنظیموں کے جال کے ذریعے سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے‘ اس سے قطع نظر کہ یہ بات کتنی درست تھی تاہم اس بارے میں ہمیشہ یہ تاثر دیا گیا کہ ہمیں ایک ایسے دشمن کا سامنا ہے جو کمیونسٹ بلاک کی طرح پھیلا ہوا ہے اور اس کے لیے ''آزاد دنیا'' کے وسائل کو مل کر استعمال کرنا ہوگا۔

کیا لامحدود جنگ بہترین حل ہے؟

جیسا کہ ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ 11 ستمبر کے حملوں کے بعد پوری دنیا کی طرف سے امریکہ کو حاصل شدہ حمایت عراق پر یک طرفہ چڑھائی سے کم ہوگئی۔ یہ جنگ مسخ شدہ سچائی' غلط قیافوں اور صدام حکومت کے خاتمے کے بعد کی صورتحال کی بہت کم تیاری کی بنیاد پر شروع کی گئی۔ ان حالات میں جبکہ عالمی برادری 11 ستمبر کی دہشت گردی سے افسردہ اور خفا تھی' کئی لوگوں کو امید ہوئی کہ عالمی سطح پر قائم ہونے والا یہ اتحاد آئندہ ایسے کسی حملے کی روک تھام کے لیے مختلف قسم کی قیادت پیدا کرے گا' کئی لوگ چاہتے تھے کہ حکومتیں نہ صرف دہشت گردی کے نیٹ ورک کو سبوتاژ کریں بلکہ ایسے نیٹ ورکس میں بھرتی کی بنیادی وجوہات کا تدارک کرکے اس حوالے سے تناؤ کو ختم کریں' لیکن مشرق وسطیٰ میں غلبے کے لیے نظریات میں تصادم نے ان امیدوں پر پانی پھیر دیا اور ہم سب کو مزید خطرے کے دہانے پر لا کھڑا کیا۔

یقیناً اس وقت کسی قسم کا تصادم پایا جاتا ہے' دہشت گردی ایک ایسا خطرہ ہے جس سے لازماً نمٹنا ہوگا' چاہے یہ دہشت گردی کسی فرد یا گروپ کی ہو یا اس میں ریاست ملوث ہو' لیکن دہشت گردی اور اس کا جواب تہذیبوں کے تصادم کا عکاس ہے؟ اس تصادم کو سیاسی/نظریاتی حل کے لیے کسی حد تک مذہب یا کلچر کی Manipulation سے جوڑا جاسکتا ہے؟ چاہے مذہب کو توڑنے مروڑنے والے کے مذہبی یا ثقافتی عزائم کچھ بھی ہوں' اسلحے کی صنعت کے لیے ٹیکس ادا کرنے والوں کی سبسڈیاں اور فوجی اخراجات کا مسلسل جواز مزید جتنا فراہم کیا جاتا رہے گا' اس طرح عالمی غلبے کو کتنا منصفانہ قرار دیا جائے گا' اس وقت اس نئے عالمی خطرے کا واحد جواب صرف جنگ یا جنگ کی تیاری کو سمجھا جارہا ہے۔

اس تصادم کی تہہ میں اس صورتحال میں موجود مسائل کے تناظر میں نئی اپروچ کی کتنی گنجائش ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ پالیسیوں پر بحث و مباحثے کے لیے دنیا کی ''عظیم ترین'' جمہوریت میں بھی رواداری کا عنصر بہت کم نظر آتا ہے۔ ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کا مطلب کیا یہ ہے کہ معصوم شہریوں پر دہشت گردی کا ارتکاب کرتے ہوئے بم برسائے جائیں' یہ اقدام مشکوک' تکلیف دہ حتیٰ کہ غداری ہے' ہمارے مشترکہ انسانی تحفظ اور تنازعات کے حل کے لیے بامقصد مکالمے کو تخیلاتی سمجھ کر یکسر مسترد کر دیا گیا ہے یا اس کو قابل غور ہی نہیں سمجھا جارہا۔

لیکن بامقصد مباحثۂ تجزیے اور کثیر الجہتی عمل کے مطالبے کو تخیلاتی قرار دینا میرے نزدیک نتائج کنٹرول کی کوشش اور غور وفکر کو مسترد کرنے کے مترادف ہے۔ نائن الیون سے پہلے ہماری انٹیلی جنس اور قیادت کی ناکامی اس کے بعد صدام دور کے بعد کی پیچیدہ صورتحال کے تناظر میں ہم ابھی تک اس حقیقت کا اعتراف معطل کرنے کی توقع کرتے ہیں کہ یہ محض ''چند سیانے'' ہیں جن کی معلومات تک رسائی ممکن ہے اور باقی ماندہ ہم سب کو ہماری مشترکہ سلامتی کو درپیش خطرے سے نمٹنے میں کوئی کردار ادا کرنے کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔

میرا خیال ہے کہ اگر ہم دہشت گردی کے خلاف لڑائی کو ''تہذیبوں کے تصادم'' میں تبدیل ہونے سے روکنا چاہتے ہیں تو ہمیں دہشت گردی سمیت دنیا کے دیگر مسائل پر اپنا انداز فکر' انداز قول وفعل تبدیل کرنا ہوگا۔ دہشت گردوں کو سمجھنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ہم نے ان ملکوں کا کھوج لگا لیا ہے جہاں سے دہشت گردی منتقل ہوئی' ہمیں ان پس پردہ سیاسی قوتوں کی شناخت کرنا پڑے گی جو معصوم افراد میں مرنے مارنے کی تحریک پیدا کرتے ہیں' ایک ایسی دنیا جس پر محض چند افراد حاوی ہوتے چلے جا رہے ہیں اور جو یہ تصور دیتی ہے کہ دیگر کئی افراد کی فکر نہ کرو میں حالات معمول پر لانے کے لیے موزوں اقدامات کرنا پڑیں گے' جب تک ہم انسانی سکیورٹی کے لیے مشترکہ خطرے سے مل جل کر نمٹنے کی کوشش نہیں کرتے جو نچلی سطح پر عدم مساوات سے پیدا ہوتا ہے ہم دنیا کو محفوظ نہیں بنا سکتے۔

اگر ہم واقعی ایک عالمی برادری ہیں تو دنیا ہمارے مشترکہ مستقبل کے تعین کے لیے کسی ایک طاقت چاہے یہ کوئی بھی ہو کا انتظار نہیں کر سکتی' جیسا کہ انہوں نے عالمی عدالت برائے جرائم اور بارودی سرنگوں پر پابندی کی تحریک کے دوران کردار ادا کیا' ہم خیال حکومتوں کو مشترکہ کاز کے فروغ کے لیے اپنی قیادت کو توسیع دینا ہوگیاور ہماری مشترکہ سلامتی کو درپیش چیلنجوں سے نمٹنے کے نئے راستوں کی تلاش کے لے سول سوسائٹی کا تعاون حاصل کرنا ہوگا۔ کوئی ایک حکومت' ایک ادارہ ہم سب کی ضروریات پوری نہیں کر سکتا۔

نئے حل کی تلاش کے لیے نئے اتحادوں کا مطالبہ کسی کو تنہا کرنے کی کوشش نہیں بلکہ یہ ہمارے مستقبل کی انفرادی یا اجتماعی ذمہ داری سے صرف نظر نہ کرنے کی آواز ہے' تشدد یا سنگین چیلنجوں

سے نمٹنے کے لیے ہمیں 2004ء میں برطانوی وزیراعظم کے نام 52 برطانوی سفارتکاروں کا وہ خط سامنے رکھنا ہوگا جس میں اسرائیل اور عراق کے بارے میں پالیسیوں پر نظر ثانی کی بات کی گئی ہے۔انہوں نے لکھا تھا ''ہم آپ کے اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں کہ برطانوی حکومت کو اپنے مفادات کے لیے امریکہ کا ہر ممکن ساتھ دینا چاہیے اور ایک وفادار اتحادی کا کردار ادا کرنے کے لیے اپنا اثر ونفوذ استعمال کرنا چاہیے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان ایشوز پر اثر ونفوذ کا استعمال آج کی ضرورت ہے۔اگر ایسا نہیں تو ان پالیسیوں کی حمایت کی قطعی ضرورت نہیں جو ناکافی اور نامرادی پر منتج ہوں۔

وہ لوگ جو تشدد یا جاری ناقص پالیسیوں پر اصرار کے لیے اجتماعی سزا کو منصفانہ اقدام تسلیم کرنے سے اتفاق نہیں کرتے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مختلف قسم کے حل کے چیلنج کے لیے مشترکہ اقدامات کو ضروری سمجھتے ہیں' تبدیلی راتوں رات ممکن نہیں' لیکن یہ بے عملی کا بہانہ نہیں ہونا چاہیے' تشدد کے عمل کا رخ موڑنا ممکن ہے' ارادے پختہ ہوں تو ہر چیز کا حل موجود ہے۔کچھ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ غیر یقینی کی موجودہ صورتحال میں اس قسم کی توقعات فضول ہیں' لیکن اکثر اوقات محض چند لوگ تبدیلی کا عمل تیز کرنے کا باعث بنتے ہیں۔جیسا کہ شاعر تھیوڈور رہتک نے کہا ''ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایسے لوگ ہیں جو ناممکنات سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔''



باب10

تہذیبوں اور ثقافتوں کے مابین مکالمہ

صدر سید محمد خاتمی

تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان مکالمے کے لیے مؤثر رابطے اہم نظریات اور تعلقات کے سمجھنے کے متقاضی ہیں۔ ان میں سے ایک بنیادی چیز مکالمے اور علم کے درمیان تعلق ہے' علم دراصل مکالمے اور سننے و بولنے کے درمیان تبادلے کی پیداوار ہے اور یہ صلاحیت جب بصارت کے ساتھ ملتی ہے تو اس ادغام سے انسانوں میں انتہائی اہم جسمانی' ذہنی اور روحانی معارف اور سرگرمیاں رونما ہوتی ہیں۔ بصارت علم کی قلمرو میں توسیع کا باعث بنتی ہے اور اس سے خودی کو بھی تقویت ملتی ہے' ایک شخص دوسروں سے باتیں کرتا اور ان کی باتیں سنتا ہے لیکن قوت بصارت خودی اور دنیا کے نقطہ ادغام سے محسوس کی جا سکتی ہے اور انسان خودی کا عنوان بن جاتے ہیں۔ دوسری طرف بولنا اور سننا فریقین کے لیے سچائی اور مفاہمت کے قریب کرتا ہے' یہی وجہ ہے کہ مکالمے کا عمل بدگمان افراد کا کوئی مخصوص پیشہ ہے نہ ان لوگوں کی وراثت ہے جن کی سچائی پر اجارہ داری ہے بلکہ اس کا خوبصورت لیکن نقاب پوش چہرہ صرف ان پر عیاں ہوتا ہے جو دیگر انسانوں کے کندھے سے کندھا ملا کر اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔

تہذیبوں اور ثقافتوں کے مابین مکالمے کے تصور کی بنیاد اسی نوعیت کے سچ کی تعریف نہ کہ سچ کی فلسفیانہ تعریف میں الجھنے پر ہے' نہ ہی اصولی محور پر اس کا تعلق بولنے سے ہے' مؤثر مکالمے کے دوران سننا اتنی ہی اہمیت کا حامل ہے جتنا کہ بولنا۔

بولنے اور سننے کے لیے مخاطب ہونے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ محض مخاطب ہونے سے ہی الفاظ سنے اور کہے جاتے ہیں۔ یہ سوال خود خواستگزار ہے کہ: کب اور کس حیثیت میں انسان کو

مخاطب کیا جاتا ہے؟ اس عمل کو سائنسی معنوں میں نہیں لیا جاسکتا کیونکہ سائنس تعلقات کی دریافت اور اس کے اہتمام کی سمت میں ایک محتاط اور سوچی سمجھی منطق پیش کرتی ہے۔ سائنسی قباحتیں انسانی شعور سے آگے یا اس کے نیچے تک رسائی حاصل نہیں کرسکتیں' اس کے برعکس آرٹ اور مذہب آپ کے ارادوں اور انداز تخاطب کا درست احاطہ کرتے ہیں۔ آرٹس ہم سے اسی طرح مخاطب ہوتے ہیں جس طرح کہ مذہب' یہی وجہ ہے کہ صوفیانہ اور مذہبی زبانیں انتہائی گہرائی میں باہم منسلک ہوتی ہیں۔ اور اس بات میں کوئی حیرت نہیں کہ ابتدائی دور میں انسان کا فنکارانہ کردار انتہائی مقدس سمجھا جاتا ہے۔ ہمیں قرآن اور انجیل میں کئی مقامات پر ''اے لوگو'' کی آواز نظر آتی ہے' وہاں شخصی سطح پر لوگوں کے تصور پر بحث کی گئی ہے۔ لفظ ''شخص'' کو لاطینی زبان میں ''ماسک'' یا ڈرامے کے اداکاروں کے بہروپ کے الفاظ میں استعمال کیا گیا ہے۔ مذہبی تعلیمات کے لئے تخاطب میں مخصوص حالات کو چھوڑ کر جب الوہی الفاظ میں انسان کو مخاطب بنایا جاتا ہے تو یہ بات درست ہے کہ اس میں انسان کے تاریخی پس منظر اور اس کی روح کو مخاطب کیا جاتا ہے۔ یوں الوہی مذاہب کے مابین ان کے بنیادی پیغام یا روح کے درمیان کوئی تنازعہ نہیں بلکہ ان کے اختلافات کا تعلق مخصوص قوانین' ضابطوں اور سماجی و قانونی پہلوؤں سے ہے۔

یقیناً اس میں تہذیبوں اور ثقافتوں کے مابین مکالمے کی تجاویز سے فوری نتائج حاصل کرنے کی غیر منصفانہ خواہش بھی خطرناک ہے۔ یہی عنصر اتنا ہی خطرناک ہوسکتا ہے جتنا غیرضروری طور پر مایوسی کا عنصر' مایوس کن صورتحال پر حقیقی تناظر کے برعکس ضرورت سے زائد زور دینا اور مکالمے کی راہ میں حائل رکاوٹیں خطرناک ہیں' لہٰذا ہم سب کو مکالمے کے عمل کے راستے میں حائل طویل سازشی رکاوٹوں سے آگاہ ہونا ہوگا۔ ان مشکلات اور رکاوٹوں کو سامنے رکھتے ہوئے نئے نظریے کے تناظر میں انسانی مستقبل اور تاریخی حوالوں کی مستقل تلاش کا کام کرنا چاہیے۔ اس تجویز کا بین الاقوامی برادری بالخصوص اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی اسی طرح دانشوروں اور عالمی رائے عامہ کی طرف سے خیرمقدم بذات خود قابل ستائش اور قابل قدر ہے' جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ عالمی رائے عامہ تبدیلی کے لیے اتنی جلد آمادہ نہیں ہوتی۔

تہذیبوں اور ثقافتوں کے درمیان مکالمے کی مختلف سطحوں پر مختلف طریقوں سے وضاحت اور

تشریح کی جاسکتی ہے۔مناسب مباحثے کی راہ ہموار کرنے کے لیے مکالمے کے اہم پہلو روشن کرنے کی عکاسی کرنا ضروری ہے،جس کے لیےعظیم مفکرین کی پیروی کرتے ہوئے فلسفیانہ اور تاریخی مباحثے کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اس سلسلے میں ایک پہلو سے پہلوتہی نہیں کی جاسکتی: وہ یہ کہ مکالمے کے دومطلب ہوتے ہیں' ایک حقیقی دوسرا خیالی' جب ہم دنیامیں مکالمے کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس میں ان دونوں معانی کا شامل ہونا ناگزیر ہے۔

تہذیبوں اور ثقافتوں کا مکالمہ بظاہر متنازعہ اور متصادم خصوصیات کا مرقع نظر آسکتا ہے۔ایک طرف یہ عمل اتنا قدیم ہے جتنی انسانی تہذیب وثقافت پرانی ہے تو دوسری طرف یہ ایک نیا اور اچھوتا خیال بھی ہے۔ اس بظاہر تنازعے کوحل کرنا مشکل نہیں ہونا چاہیے ۔ایک غیر حقیقی شخص تہذیبوں کے مابین مکالمے کی اس کی قدیم حیثیت کے لحاظ سے تعریف کرسکتا ہے جبکہ روایتی شخص ''ثقافت''، ''تہذیب'' اور انسان کوانسانیت کے مجموعی وجود'غیر محدود اور مہنگی نوعیت کے تناظر میں دیکھتا ہے اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ کوئی تہذیب وتمدن دیگر تہذیبوں سے الگ تھلگ ہو کر جنم نہیں لیتی' وہ تہذیبیں جو قائم رہتی ہیں ان میں تبادلے بالخصوص سننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔سننا ایک نیکی ہے جس پر عمل ہونا چاہیے اور عمل کے لیے بامعنی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ سننے کا عمل خاموشی کی طرح منفی اقدام نہیں بلکہ اس کے ذریعے سننے والا خود کو دیگر دنیا پر آشکار کرتا ہے' کسی کو سنے بغیر مکالمے کا عمل ناکامی سے دوچار ہوگا۔تہذیبوں کے مابین مکالمے کوتفصیل سے سمجھنے کے کئی اثرات ہوتے ہیں'ان میں سے ایک سٹیٹس مین اور فنکاروں کے درمیان تعلقات اور دوسرا اخلاقیات اور سیاسیات کے درمیان رابطوں پر مشتمل ہوتا ہے'عظیم سٹیٹس مین اور فنکار میں تعلق کیا ہے؟ اور یہ دونوں کس طرح ایک دوسرے سے مماثل ہیں۔سیاست شناسی فن کی ایک شکل ہے لیکن فنکار وہ ہوتا ہے جو حال میں رہ سکتا ہے اور اسے امر کر دیتا ہے۔ یہ کسی فنکار کی عظمت کا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ اپنی فنکاری کومستقل شناخت دے تاکہ ہم کسی مناسب وقت اور مقام پر اس کے کام کو سمجھ سکیں۔یوں عظیم فن کی تاریخی حیثیت کا تعین اس کے مستقل نوعیت سے کیا جاسکتا ہے۔ بالکل اس طرح اقوام اور معاشروں کی تاریخی منزل کو اکثر تاریخ ساز عظیم سٹیٹس مین اپنے ہاتھ سے رقم کرتے ہیں۔

تخلیقیت ایک اور خوبی ہے جو سٹیٹس مین اور فنکار دونوں میں پائی جاتی ہے' اس عمل میں اچھوتا پن ہوتا ہے اور جہاں مکرر اور نقل کی کوئی گنجائش نہیں' تخلیقی صلاحیت کے مکمل اداروں کا انحصار جرأت اور اخلاقی رجحان پر ہوتا ہے' عظیم فنکار اپنے فن کو تخلیقیت اور دلیری سے سجاتے ہیں' اسی طرح عظیم سٹیٹس مین اپنے ملک کے مسائل کا جرأت مندی کے ساتھ سامنا کرتے ہیں' تہذیبوں کے مابین مکالمے کے آغاز کی اپنی کوششوں میں آج سٹیٹس مین حضرات کو زیادہ انصاف اور ہمدردی کی سمت میں بنیادی قدم اٹھانا پڑیں گے۔ اور ثقافتوں کے درمیان مکالمے کے لیے اخلاقیات اور سیاست میں کیا ربط ہے؟ اس ربط کے نظریاتی پہلو کو کافی توجہ ملتی ہے' مخصوص ربط اور یہاں بیان کی گئی اہمیت دراصل ہماری تجویز کا اخلاقی پہلو ہے۔ ثقافتوں کے درمیان مکالمے کے لیے سیاسی اخلاقیات میں بنیادی تبدیلی نہایت ضروری اور ناگزیر ہے۔ سیاست میں بین الثقافت' مکالمے اور بین الاقوامی تعلقات سمجھنے کے لیے شرکت' فرائض کی تکمیل اور لچک بنیادی اخلاقی شرائط ہیں' ایسی حکومتیں جو معاشی' مادی اور فوجی طاقت کے بل بوتے پر اپنی منطق دوسروں پر ٹھونسنے کی کوشش کرتی ہیں اور اپنے مفادات کے لیے دھوکہ دیتی ہیں کو مکالمے کی منطق پر کان دھرنے چاہئیں۔ تبدیلی صرف زبان اور اصطلاحات میں لانے کی ضرورت نہیں ملک تعلقات اور ان کے انتظامات میں بھی قابل ذکر تبدیلی ہونی چاہیے۔ استدلالی سوچ کو انسانی جذبات کے ساتھ ہم آہنگ کرنا ہوگا۔ معروف فارسی شاعر سعدی شیرازی کی اس نظم کو دل کی گہرائیوں سے قبول کیا جائے کہ ''تمام انسان ایک ہی جسم کے اعضاء ہیں اور ان کی تخلیق ایک ہی طرح ہوئی۔'' یہ قومی اور بین الاقوامی' زندگی دونوں میں ازحد درکار ہے۔ بامقصد سوچ کے حامل مفکرین اور فنکاروں کے ذریعے یہ تبدیلی آنی چاہیے' ہمیں سفارتی طریقوں سے روکھی زبان استعمال کرنے والوں کی مزید کوئی ضرورت نہیں' ہم اس کی جگہ زندگی سے بھرپور' متحرک' اخلاقیات اور ہمدردی کی زبان استعمال کرنا پسند کریں گے۔

یہاں مکالمے کا لفظ مختصر معنوں میں استعمال کیا گیا ہے جو ''ثقافتی وتہذیبی تبادلے'' یا تاثر کے عمومی معنوں کی حامل اصطلاح سے مختلف ہے' دونوں میں ابہام نہیں ہونا چاہیے۔ ثقافت وتمدن کے باب میں مشترکہ تاثر اسی طرح ثقافتی اور سائنسی تبادلے کی بنیاد فتح پر ہوسکتی ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایک ثقافت یا تہذیب کو طاقت کے بے رحمانہ استعمال سے مقابل تہذیبوں پر حاوی کیا جاتا

رہا اور آج کے دور میں یہ کام مواصلاتی ٹیکنالوجی کے ذریعے کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا مکالمے کو جس انداز میں ہم لیتے ہیں اور جیسا کہ اس پر بحث بھی کی گئی ہے کو اسی صورت میں سمجھا اور اختیار کیا جاسکتا ہے جب ہم اس کے بالخصوص فلسفیانہ، اخلاقیاتی اور نفسیاتی پہلوؤں کو سامنے رکھیں گے۔ یوں مکالمے کے دفاع کی بنیاد کسی عالمی تناظر اور کسی فلسفیانہ، سیاسی یا اخلاقی نظام پر نہیں رکھی جاسکتی۔ مکالمے کے آغاز کے لیے ہمیں عمومی جامع اصولوں کی تشکیل کرنا ہوگی جس کے بغیر مختصر سوچ کی حامل دنیا میں مکالمہ ناممکن ہوگا۔ اس سطح کے نظریات کی عالمی سطح پر تشہیر کے لیے یونیسکو جیسے اداروں کو کردار ادا کرنا ہوگا، ایسی حکمت عملی اور تہذیبوں کے درمیان مکالمے کی تجویز کی روح مثبت سوچ کے حامل افراد اور اعتدال پسندوں کی سوچ سے متصادم نظر آتی ہے۔ یوں مکالمے کے خیال کے حامی مفکرین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی فلسفیانہ اور نظریاتی اساس کو مزید بہتر کریں تاکہ مکالمے کو نظریاتی دشمنی کے حملوں اور سچائی سے روکنے کے کسی امکان سے بچایا جاسکے، اسے بے انتہا مابعد جدیدیت کے ایسے مفکروں سے بھی محفوظ رکھنا ہوگا جو کروڑوں مصیبت کے مارے اور محروم افراد کے مسائل کو غلط تناظر میں دیکھتے ہیں۔

تہذیبوں کے مابین مکالمے کے آغاز کے لئے ایک اہم پیشگی چیز رواداری ہے۔ برداشت کا عمل مکالمے کے ابتدائی مرحلے میں انتہائی اہم ہے۔ اس طرح منفی رواداری اور مشرق کے فلسفے اور مذہبی سوچ پر استوار مثبت سوچ کے درمیان گہرا فرق پایا جاتا ہے، ہماری دنیا کے لیے مکالمے کو ایک نظریہ بنانے کے لیے ہمیں منفی رواداری کو مثبت اور مشترکہ سوچ میں تبدیل کرنا ہوگا۔ قرآن پاک مسلمانوں سے کہتا ہے کہ ''نیکی اور فلاح کے کاموں میں ساتھ دو۔'' (پارہ : 5،2) ' تیسری ہزاری کے آغاز پر دنیا کو تعمیری بنانے کے لیے تمام انسانوں کو حقیقت پسندانہ اور مثبت کردار ادا کرنا ہوگا۔ کسی معاشی، فلسفیانہ اور سیاسی جواز کی آڑ میں کسی قوم یا افراد کو محروم نہیں کیا جانا چاہیے، ہمیں صرف روادار نہیں بلکہ مائل بہ تعاون بھی ہونا چاہیے۔ عالمی برادری دراصل تمام انسانی برادری کو تعاون کا حامل ہونا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ بیسویں صدی، حتیٰ کہ چند برس پہلے تک یہ ایک محض دلفریب نعرہ ہو، لیکن اب یہ بنی نوع انسانی کی بقا کے لیے ناگزیر ضرورت ہے۔

تعاون اور اشتراک کا یہ تصور محض سماجی' سیاسی یا اقتصادی نوعیت کا نہیں ہونا چاہیے' لوگوں کے دل قریب لانے کے لیے پہلے ہمیں ان کے ذہن ملانے ہوں گے' متنازعہ فلسفیانہ' اخلاقی اور مذہبی اصولوں پر یقین امیدوں اور دلوں کے قریب لانے کے منافی ہے۔ یوں دلوں کے درمیان قربت کے لیے پہلے ذہنوں کی قربت ضروری ہے اور یہ منزل ایسے مفکرین کے تعاون کے بغیر حاصل نہیں کی جاسکتی ہے جو ذہنوں کو سمجھتے ہیں' ہم سب کو تصورات کے بنیادی معانی کے تبادلے کی سنجیدہ کوششوں کی ضرورت ہے اور ہمیں خود مدد' زندگی اور موت کے اپنے تصورات کی وضاحت اور تشریح کرنے کی ضرورت ہے۔ اس طرح مختصر المدت نتائج حاصل ہو سکتے ہیں اور اس کی عدم موجودگی میں مفاہمت کے بغیر صرف معاشی یا سیاسی مفادات پر استوار نظام ڈگمگا سکتا ہے۔

جنگوں' خونریزی اور ایکسپلائٹیشن کے لحاظ سے گزشتہ 20ویں صدی شاید تاریخ کی بدترین صدی ثابت ہوئی جبکہ اس کے مثبت نتائج اور پہلو عظیم مفکرین کی سوچ اور عظیم سٹیٹس مین کی پالیسیوں کا نتیجہ تھے۔ گزشتہ صدی کی ہولناکیوں کو موجودہ دور میں سیاسی سوچ میں بنیادی تبدیلی اور بین الاقوامی تعلقات کے فروغ اور مکالمے کے ذریعے بھلایا جاسکتا ہے۔



باب11

کثیر القومی اخلاقی مکالمے

ایمیٹائی زیونی

عالمی سطح پر مروجہ اقدار کے فروغ سے ہٹ کر مشرق اور مغرب دونوں میں مختلف اقوام کے لوگوں کو مخصوص ایشوز پر مشترکہ اخلاقی مفاہمت پر متفق کرنے کا ایک عمل بھی موجود ہے'ان میں بارودی سرنگوں پر پابندی کی تحریک سے گلوبل وارمنگ سے نمٹنے کے اقدامات تک اور بچوں کی جنسی عکس بندی Child Pornography کی مذمت سے لے کر خود مختار ملکوں پر حملوں کی مخالفت کے ایشوز شامل ہیں۔ایسی مفاہمت عالمی رائے عامہ کے فروغ کا باعث بنتی ہے'اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ کوئی اپنے طور پر دوسرے کے ساتھ سمجھوتہ کرسکتا ہے یا یکا وتنہا باخبر اور شامل معاملہ ہے' یہاں تک کہ ترقی یافتہ اور جمہوری ملکوں میں بھی ہوشیار عوام......ایسے لوگ جو عوامی معاملات پر عمل پیرا ہوتے ہیں اور سرکاری پالیسیوں پر رائے زنی کرتے ہیں......بھی مخصوص تعداد میں پائے جاتے ہیں اور مکمل اتفاق رائے نظر نہیں آتا'اس کے باوجود ان ہوشیار عوام کی جو اکثریت کبھی اس سمت اور کبھی دوسری سمت میں چلتی ہے' سرکاری امور پر اثر انداز ہوتی ہے' اس کے لیے چند سطروں پر مشتمل طریقہ کار پر عمل درآمد کیا جاتا ہے جو میرے نزدیک اخلاقی مکالمہ کہلاتا ہے۔

یہ اخلاقی مکالمہ اس وقت وجود میں آتا ہے جب لوگوں کا ایک گروپ ان اقدار کی چھان بین کے عمل میں مصروف ہوجاتا ہے جو ان کی زندگیوں کی رہنمائی کرتی ہیں' یہ اقدار ضروری نہیں کہ شائستگی'اعتدال پسندی اور ایمان داری جیسی شخصی خوبیاں ہوں بلکہ وہ اقدار جو کسی ملک میں سرکاری پالیسیوں کی حمایت کرتی ہیں وہ سمجھی جاتی ہیں' ان معاملات میں ٹھوس عملیت' پناہ گزینوں سے حسن سلوک' ہم جنس پرستوں کی شادی کا حق اور سزائے موت ہونی چاہیے یا نہیں جیسے دیگر ایشوز شامل ہیں۔

اخلاقی مکالمے اکثر مسائل کے حامل ہوتے ہیں' ان کا کوئی واضح آغاز ہوتا ہے نہ اختتام' یہ اکثر تحمل آمیز ہوتے ہیں اور متنازعہ بھی ہوتے ہیں' یہ بھی ٹھیک ہے کہ بسااوقات ان کے نتیجے میں نئی مشترکہ مفاہمت بھی سامنے آتی ہے جو بدلے میں نہ صرف لوگوں کی زندگی کو متاثر کرتی ہے ان کی سرگرمیوں پر بھی فرق پڑتا ہے اور ایسے افعال جنہیں عموماً نیکی اور قلبی عادات سمجھا جاتا ہے بھی زد میں آتے ہیں' اس کی بہترین مثال ماحولیات سے متعلق مذاکرات کے آغاز کا عہد ہے جس کی تحریک مشہور رائٹر راکیل کارسن کی کتاب ''سائلنٹ سپرنگ'' سے ملی' اس طرح مرد اور عورت کے تعلقات اور انسانی حقوق پر اخلاقی مکالمے کا آغاز بیٹی فرائیڈن کی تصنیف The Feminist Mystique سے متاثر ہوکر کیا گیا' یوں 1960ء کے عشرے میں نسلی تعلقات میں تبدیلی اور شہری حقوق کی تحریک امریکہ میں تمباکو نوشی پر عوامی مقامات پر پابندی اور تمباکو نوشی کے ''نان سموکہ'' کر افراد پر اثرات سے آگاہی کے ایشو منظر عام پر لائے گئے۔

یہ زیادہ مشکل نہیں کہ منظّم معاشروں میں اسے مکالموں کے مسلسل وقوع پذیر ہونے ......اور اکثر نتیجہ خیزی کے ساتھ......کی راہ ہموار کی جائے۔ بعض اوقات جمہوری معاشروں میں مکالمے کا یہ عمل طوالت بھی اختیار کرسکتا ہے' لیکن کیا مکالمے کا یہ عمل کثیرالقومی بھی ہوسکتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کے اثرات کیا ہوں گے؟ یہ مکالمہ جات ہی ہیں جو عالمی متنوع اقدار کی عمومی ترقی سے منسلک ہیں اور ایسی مشترکہ اخلاقی مفاہمت کی تشکیل کرتے ہیں' جو مخصوص سرکاری پالیسیاں مستحکم کرسکتی ہیں' کثیرالقومی اخلاقی مکالمہ جات اپنے ہمسر بین القومی کے مقابلے میں اپنی شدت' دائرہ کار اور نتیجہ خیزی کے لحاظ سے کہیں زیادہ محدود ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے کی بہ نسبت اب یہ مشترکہ مفاہمت' سیاسی کلچر اور کثیرالقومی اداروں کی قانونی حیثیت کا آغاز کررہے ہیں۔ مثال کے طور پر کثیرالقومی مکالمے کے نتیجے میں یہ طے کیا گیا تھا کہ ''ہم خواتین کے حقوق کا احترام کرنے' جمہوریت کے فروغ اور سپر پاورز کو ''ہماری'' مرضی کے بغیر من مانی کرنے سے روکنے پر کاربند ہیں۔''

یہ سچ ہے کہ ایسے مکالموں کو کئی قسم کے غیر روایتی تصورات جو اکثر روایت کا بہروپ دھارے ہوتے ہیں' سے نقصان پہنچتا ہے' یہ بھی غلط نہیں کہ ایسے مکالمہ جات مختلف قومیتوں کے افراد کو اخلاقی

حوالوں سے متاثر کرتے ہیں‘اس طرح‘اکثر ملکوں کی طرف سے ماحولیاتی آلودگی کے حوالے سے غیر ذمہ دارانہ رویہ اختیار کرنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ ملک دیگر ممالک کی نظر میں خود کو قانون شکن قرار دینا نہیں چاہتے۔(1)اس کے علاوہ کثیر القومی اخلاقی مکالمے تین سطحوں پر وقوع پذیر ہوتے ہیں‘ کیا ایک کلچر کے حامل لوگوں کو دیگر ثقافتوں پر ''فیصلہ'' دینا چاہیے؟ اگر ہاں تو ان فیصلوں کی رہنمائی کون سے اقدار کریں گی؟اوران اقدار کی مضبوطی کے لیے تقریروں اور علامتی استعاروں سے آگے کون سے معانی استعمال کیے جانے چاہئیں؟ مثال کے طور پر اس بات پر زبردست اتفاق پایا جاتا ہے کہ دہشت گردی سے نمٹا جائے لیکن اس پر زیادہ اتفاق نہیں کہ اس کے کون سے طریقے اختیار کیے جائیں۔

ان تمام عالمی مکالموں میں سے بالخصوص وہ ایشوز زیادہ اہم ہیں جونئی عالمی آرکیٹیکچر کی ترقی سے متعلق ہیں‘ موجودہ حالات میں ان سطور میں جن مکالموں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں اس اہم سوال پر توجہ مرکوز کی گئی ہے: وہ کون سے حالات ہیں جن میں یہ بات جائز قرار دی جاسکتی ہے کہ کوئی ملک یا گروپ دیگر ممالک کے معاملات میں مداخلت کرے؟ کچھ مبصرین اب بھی اس اصول سے اتفاق کرتے ہیں کہ چاہے کسی ملک میں کچھ بھی ہوکسی اور کو اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے‘اور ہر قوم خود مختار ہے اور حق خود ارادیت کے اصول کو تسلیم کیا جانا چاہیے‘ اور یہ کہ کسی قوم کو دوسرے ملک کے خلاف طاقت کے استعمال کا کوئی حق نہیں‘ شاید انسانی حقوق کو تسلیم کرنے کے بڑھتے رجحان سے کئی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دیگر ملکوں‘ اقوام متحدہ اور ایک لحاظ سے عالمی برادری کو کسی مقام پر انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں رکوانے کے لیے دیگر تمام کرپشن ختم ہونے پر طاقت کا بھی استعمال کرنا چاہیے۔(2)

انسانی مقاصد کے لیے مداخلت کی عالمی اخلاقی حمایت میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے‘ کئی طاقتور ممالک اور کچھ کم طاقتور ملکوں کو اس بات پر سخت تنقید کا نشانہ بنایا جارہا ہے کہ انہوں نے افریقی ملک روانڈا میں 8لاکھ افراد کا قتل عام رکوانے کے لیے مداخلت کیوں نہیں کی‘اس طرح کانگو اور بعض دیگر مقامات پر(3)موثر نسل کشی روکنے میں ناکامی پر بھی عالمی طاقتوں کو ہدف تنقید بنایا گیا‘نسل کشی جیسی بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کے مرتکب افراد پر مقدمہ چلانے کے لیے عدالت قائم

کرنے کا مطالبہ بھی زور پکڑتا جارہا ہے۔ یہ عدالت انٹرنیشنل کریمنل کورٹ کے علاوہ ہونی چاہیے۔

یکطرفہ فوجی کارروائی کی متعلقہ مخالفت میں بھی حیران کن طور پر اضافہ ہوا ہے۔مشرق اور مغرب دونوں میں کئی حلقے کہتے ہیں کوئی بھی ایکشن مختلف قوموں کے اتحاد کی صورت میں ہونا چاہیے اوراس گروپ کے ہر رکن کو ویٹو کا اختیار ملنا چاہیے۔اس کی ایک مثال نیٹو ہے' کچھ دیگر کا خیال ہے کہ ایسی کوئی کارروائی اقوام متحدہ کی منظوری سے اس کے قوانین کے تحت کی جانی چاہیے۔ سربراہان حکومت اور شہریوں کو ایسے مؤقف کے اختیار کرنے کی تحریک کا اکثر اخلاقیاتی پہلو سے بہت کم تعلق ہوتا ہے' اس کی بجائے یہ کمزور طاقتوں کی طرف سے طاقتور ملکوں بالخصوص سپرپاور کی راہ روکنے کی خواہش کا مظہر ہوتا ہے۔ یا یہ روس اور فرانس جیسی طاقتوں کی تحریک ہوتی ہے جو کبھی دنیا کے بڑے کھلاڑی رہے ہیں اور دوبارہ عالمی سٹیج پر اثر ونفوذ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یا ملکی سطح پر اس کارڈ کو الیکشن جیتنے کے کارڈ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے (جیسا کہ جرمن چانسلر جیراڈ شیروڈر اور جنوبی کوریا کے صدر روہ موہیون نے 2003ء میں کیا۔) یہ بات بالکل واضح ہے کہ یکطرفہ کارروائی کی مخالفت اور اقوام متحدہ کی رضامندی حاصل کرنے کے مطالبے کو زبردست پذیرائی مل سکتی ہے اور اس کا احترام کیا جانا چاہیے۔ کثیرطرفہ اقدامات کو بہرحال یکطرفہ کارروائی پر ترجیح حاصل ہے اور عالمی قوانین پر عملدرآمد بھی اہم ہے کیونکہ اس سے مشترکہ اخلاقی مفاہمت کی سمت کا تعین ہوتا ہے' لیکن یہی رہنما دعوؤں کے برعکس اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے اپنا مؤقف الٹ بھی سکتے ہیں' جس انداز میں وہ اپنے دلائل کی تشہیر کرتے ہیں اس مشترکہ کثیرالقومی اقدار کی سمت سامنے آتی ہیں۔

یہ کہنا کہ اس وقت کثیرالقومی مشترکہ اخلاقی مفاہمت وقوع پذیر ہورہی ہے جس کے نتیجے میں قانونی اقدامات اور ادارے متاثر ہوتے ہیں' اس کا مطلب یہ نہیں کہ عالمی رائے عامہ قطعی طاقتور اور مؤثر ہے' فوجی طاقت اب بھی بڑا کردار ادا کررہی ہے اور عالمی سطح کے خیالات کی نفی کرتی ہے' اس طرح معاشی فیکٹر بھی نمایاں کردار ادا کرتے ہیں اور حکومتیں غیرملکی امداد' قرضوں اور دیگر مراعات ملنے کے وعدے پر اپنی پالیسیاں تبدیل کرلیتی ہیں۔اس کے باوجود رائے عامہ اب بھی ایک اہم فیکٹر ہے جو اقدار کی طاقت کی شدت کا مظہر ہے' اس رائے کی مختصر اور طویل المدت قیمت ہوسکتی ہے' اگر عالمی اداروں کی پیشرفت موجودہ نہج پر آگے بڑھتی ہے تو عالمی امور کی مستقبل کی سمت میں اہمیت میں اضافہ ہوگا۔

مڈیسن ایونیو کے مکتبہ فکر کے افراد سمجھتے ہیں کہ رائے عامہ کو اشتہاروں، تصاویر اور رنگین (4) بروشروں سے تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اس نظریے کے حامی مثال دیتے ہیں کہ برٹنی سپئیرز کے عرب اور مسلمان ملکوں میں میوزیکل شو کرنے سے کروڑوں نئے مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اس طرح اشتہارات سے ایک چیز کے خریداروں کو دوسری برانڈ کی چیز استعمال کرنے کی تحریک دی جاسکتی ہے۔(5) مثال کے طور پر کوک کی جگہ پیپسی' خصوصاً جبکہ ان مصنوعات کے درمیان فرق کم ہے اور تشہیری مہم پر لاکھوں ڈالر خرچ کیے جاتے ہیں لیکن بات جب اخلاقی معاملات کی آتی ہے تو کئی فیکٹر رائے عامہ ہموار کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ ان میں مذہب، تعلیم، عوامی دباؤ اور آزاد میڈیا شامل ہے۔ سچی رائے عامہ کو بسااوقات گمراہ سمت سے ہٹایا جاسکتا ہے' تاہم ایک سپر پاور جو یہ سمجھتی ہے کہ وہ ''میڈیسن ایونیو'' نظریے کے تحت رائے عامہ کو بدل سکتی ہے کو پتہ ہونا چاہیے کہ عوام کے خیالات بذات خود قوت کے حامل ہوتے ہیں۔ یوں عالمی تقسیم سے متعلق اہمیت نہ صرف عمومی روایتی مقاصد سے منسلک ہوتی ہے بلکہ ایک نئے قانونی عالمی آرکیٹیکچر کی ترقی کے لیے ایک اہم عنصر ہے۔(6)

نوٹس

1- دیکھئے گیرتھ پوارٹر اور جینٹ ویلشبراؤن کی کتاب ''گلوبل اینوائرنمنٹل پالیٹکس''۔

2- چارلس ٹیلر دلائل دیتے ہیں کہ انسانی حقوق پر رضاکارانہ عالمی اتفاق پایا جاتا ہے' اگرچہ مختلف کلچر ان عالمگیر اقدار کے جواز سے عدم اتفاق کرسکتے ہیں۔ دیکھئے کتاب ''دی ایسٹ ایشین چیلنج فار ہیومن رائٹس''۔

3- حوالے کے لیے دیکھئے بار براہارف کی کتاب ''امریکن پولیٹیکل سائنس ریویو'' 73-57

4- امریکہ مخالف جذبات کے توڑ کے لیے کئی گروپ ''عالمی سفارتکاری'' شروع کرنے کا حل پیش کر رہے ہیں۔

5- رابرٹ سیٹلاف کا مضمون بعنوان ''عربوں کو دوست کیسے بنایا جاسکتا ہے'' دیکھئے' ہفت روزہ سٹینڈرڈ صفحہ 18 ' 18 اگست 2003ء

6- ایمیٹائی زیونی کی کتاب دیکھئے ''فرام ایمپائر ٹو کمیونٹی''

باب12

دوسرے لوگوں کے جوتوں میں

ڈیم مریلین سٹراتھن

کچھ لوگوں کے لیے اپنی صفوں میں تقسیم کرنا آسان ہوتا ہے' میرے ذہن میں بے انتہا مثالیں گھوم رہی ہیں کہ کیا کوئی قوموں' دیہات' مذاہب یا ہمسایوں کے درمیان تقسیم کے بارے میں سوچتا ہے' سماجی دانشوروں Anthropologist کی ڈائریاں ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہیں' جو تقسیم میں الگ تھلگ کرنے اور مشکلات پیدا کرنے کا باعث بنتی ہیں' لیکن اصل مسئلہ بذات خود تقسیم میں نہیں پایا جاتا' لوگوں کی دوسروں سے خود کو الگ کرنے کی صلاحیت ایک انتہائی تخلیقی اور تعمیری ذریعہ ہے اور حقیقت میں یہ تعلقات پیدا کرنے کی صلاحیت کی بنیاد ہوتی ہے' تو پھر آخر ہم غلط کیا کر رہے ہیں؟

مجھے اس سوال کی تشریح کرنے کی اجازت دیجئے' یہ دنیا کی سٹیج پر رونما ہونے والے واقعات کے مشاہدے سے سامنے نہیں آتے بلکہ انسان کا مطالعہ کرنے والے ان گنت دانشوروں نے اس کے لیے ان لوگوں تک رسائی حاصل کی جن کی دنیا کی سٹیج شہ سرخیوں کی زینت نہیں بنتی اور جن کی جارحیت اور زخم کی شدت اکثر بہت محدود ہوتی ہے' لیکن اس سے ان کی اہمیت بڑے پیمانے پر اسلحے کے انبار لگانے والے ملکوں کے عوام کی بہ نسبت کم نہیں ہوتی البتہ اس سے وہ تقسیم ضرور سامنے آتی ہے جس سے عموماً صرف نظر کیا جاتا ہے۔ شاید شدت کی نوعیت بھی مبہم ہے۔ نام نہاد مہذب معاشروں میں کم شدت کی ظالمانہ کارروائیاں بڑی شدت کے اقدامات سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں' جیسا کہ جنسی استحصال کی مثالیں آپ کو سب بتا دیں گی' اور جو شخص جادو سے بیمار ہوتا ہے یا جس کی بچے اس سے متاثر ہوتے ہیں کی زندگی اتنی ہی دردناک ہوجاتی ہے جتنا کہ اتحادی طیاروں کی ہزاروں منٹ بلندی سے بمباری سے جرمن جل کر خاکستر ہوئے تھے۔

ہمیں خود کو یہ تصور کر کے تسلی نہیں دینی چاہیے کہ ہر جگہ لوگ تنازعے کے بغیر رہ رہے ہیں۔اس سے نمٹنے کے اچھے اور برے دونوں طرح کے طریقے ہیں اور تنازعات کے ضرر رساں ہونے سے پہلے اس کی شدت کم یا زیادہ کرنے کی بھی کئی راستے ہیں' لیکن تنازعے کی بنیاد اہم ترین اجزا میں ایک تقسیم ہے اور اسے سمجھنا ضروری ہے۔

تقسیم سے میری مراد لوگوں کی خود کو دیگر افراد سے مختلف کرنے کی صلاحیت ہے' تقسیم کم و بیش سابق تعلق کی عکاسی کرتی ہے یہ اُن طریقوں کی وضاحت کرتی ہے جس سے ہم انسانیت کی تشریح سماجی زندگی کے طور پر کرتے ہیں' سماجی زندگی زیادہ تر امتیازی حیثیت اور اشتراک پر مشتمل ہوتی ہے۔ خاندان اور قرابت داری کے ارتقاء میں دلچسپی رکھنے والے انتھراپولوجسٹ حضرات تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اس تعلق کے نیچے ایک شخص کے دوسرے سے اختلافات کا عنصر پنہاں ہوتا ہے اور یوں افراد کے درمیان تعلق کے اس تصور کو رشتے یا ناتے (Bond) سے موسوم کیا جاتا ہے' ایک شخص کا اپنے پاؤں کسی اور کے جوتے میں ڈالنے کے اس عمل کو طاقتور قربت سمجھا جاتا ہے' لیکن جوتے تو بہر حال کسی اور کے ہیں ناں' جو تعلق کسی اور شخص کا میرے ساتھ ہے وہ اس طرح معکوس ہے جس طرح میرا اس شخص کے ساتھ ناتا ہے' لیکن اس کی شناخت نہیں کی جاسکتی' اگر ہم شناخت کر سکتے تو پھر خیالات کا کوئی تبادلہ نہ ہوسکتا۔

اصل میں اس شناخت کو ایک ایسی چیز سمجھا جا سکتا ہے جس سے محتاط طریقے سے گریز کیا جانا چاہیے' اس کی مثال جانشینی سے وابستہ اصولوں کے حوالے سے دی جاسکتی ہے' جانشین کو اپنے پیشرو کے ہوتے ہوئے عہدہ نہیں سنبھالنا چاہیے' مغربی افریقہ میں رائج روایت یہ ہے کہ بڑے بیٹے کو کبھی اپنے باپ کی جگہ پر نظر نہیں رکھنی چاہیے۔ اس بیٹے کو باپ سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر رہنا چاہیے' یعنی منقسم رہنا چاہیے۔ یہ بات باپ اس وقت سیکھتا ہے جب وہ خود چھوٹا ہوتا ہے اور اسے اس چمچ سے کھانے سے روکا جاتا ہے جس میں والد کھاتا ہے۔ باپ کی عدم موجودگی یا موت کی صورت میں ہی بیٹا معاملات سنبھال سکتا ہے اور اس کی جوتے پہن سکتا ہے۔ یہ ابتدائی دوری دراصل نسلوں کے درمیان ربط پیدا کرتی ہے۔

سماجی زندگی اس ربط سے جنم لیتی ہے جو ایک ناتے کے دوسرے ناتے سے تعلق سے جنم لیتا

ہے' وہ یہ کہ میری والدہ سے میرا تعلق وہی ہے جو اس کا اپنی ماں سے رہا تھا۔ یہی وہ دوسرا اصول ہے جس سے ماہرین سماجیات انسانی معاشرت کا ادراک کرتے ہیں'اس طرح رشتوں کے درمیان رشتے کے بارے میں سوچنا ممکن ہوجاتا ہے'اور اس کے پیچیدہ نتائج وعواقب کو سمجھا جاسکتا ہے'اس طرح رشتہ داری پر تجریدی انداز میں سوچنا بھی ممکن ہوتا ہے' یہاں ہم ان قوتوں اور صلاحیتوں سے آ گاہ ہوتے ہیں جو لوگ مختلف کرداروں میں ادا کرتے ہیں'بصورت دیگر یہ بات عجیب محسوس ہوگی کہ کوئی کسی لڑکے یا لڑکی کو مرد یا عورت کے روپ میں دیکھے' جیسا کہ دنیا بھر میں رسومات کے دوران ہوتا ہے'لیکن مستقبل میں ان دونوں کا جہاں بیوی کے کردار میں اکٹھا ہونا نہایت ضروری ہوتا ہے' جب مرد اور عورت کے درمیان اختلاف قربت میں بدلتا ہے تو اگلی نسلوں کی رشتہ داری جنم لیتی ہے' مستقبل دراصل پہلے سے منقسم افراد کے ملاپ سے وجود میں آتا ہے۔

لیکن پھر علیحدگی کی اتنی زیادہ کوشش کیوں کی جاتی ہے؟ یہ کوشش ان سرگرمیوں کا ثبوت ہے جو اپنی حدود میں مماثلت Sameness پیدا کرتی ہیں'لوگ بنیادی طور پر ایک ہوتے ہیں اور یہ ہماری اخلاقی ذمہ داری ہے کہ ہم ان کو تقسیم کریں' یہ مماثلت دراصل اپنے پس منظر میں اس تقسیم کی سمت میں جاتی ہے جو رشتے کے قیام کی بنیاد بنتی ہے۔ متبادل حد یہ ہے جو اختلاف کے طور پر اختیار کی جاتی ہے'لوگ اپنی عادات میں مختلف ہیں اور یہ اخلاقی فرض ہے کہ ہم بنیادی مماثلتیں تخلیق کریں۔

یہ تصور پایا جاتا ہے کہ وہ جو شباہت کی حد میں داخل ہوتے ہیں وہ متحد کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں' لیکن انہیں دیگر پہلو بھی مدنظر رکھنا ہوں گے: لوگوں کا ایک دوسرے پر انحصار تب ہوتا ہے جب ان کے کاموں کی نوعیت مختلف ہوتی ہے'اس طرح ان اختلافات سے تعاون اور اشتراک کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ لہٰذا تعاون اور اتحاد کی صلاحیت ہمارے زیر غور نہیں' اس کے برعکس مشترکہ سرگرمی کے اظہار کے لیے اختلاف کے ذریعے ایک دوسرے پر انحصار کیا جاتا ہے اور مشترکہ مقاصد کا حصول ممکن بنایا جاتا ہے۔

اس کا اطلاق بڑے سماجی شعبوں میں ہوتا ہے' ہم جس دنیا میں رہ رہے ہیں اس میں اقوام' ممالک' فرقہ وارانہ ادارے عام طور پر یہ محسوس کرتے ہیں کہ انہیں اختلاف کے باوجود باہمی تعاون

کرنا ہوگا اور اتفاق پیدا کرنا ہوگا' یہ نظریہ بدستور باقی رہتا ہے کہ: تقسیم ہمیشہ اس کے پس منظر میں موجود رہتی ہے۔ بہت زیادہ مماثلت تقسیم کی پرورش کا خدشہ پیدا کرتی ہے اس طرح کسی کو کافر قرار دینے کا خوفناک تصور اور ہوم لینڈ سکیورٹی کی ضرورت کو کچھ لوگ بدی اور دیگر افراد اجنبی خطرہ سمجھتے ہیں۔ صورتحال اس وقت بگڑ سکتی ہے جب کسی کمیونٹی کی روح مہلک اثرات پیدا کرتی ہے' جب سرحدوں پر تشدد کیا جاتا ہے اور خاندانوں کو غیر مطلوبہ قرار دیا جاتا ہے۔

چونکہ مماثلت کے ذریعے اتحاد کی اپروچ گلوبل میڈیا میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے' اس لئے میں اتحاد کے لیے متبادل روٹ کی تجویز دوں گی۔ وہ یہ کہ اقدار کے ذریعے اختلاف کا حل' ایک لمحے کے لیے مکالمے کے بارے میں سوچئے' مکالمہ صرف تنوع کا معاملہ ہے نہ مختلف نقطہ ہائے نظر کا سنگم بلکہ یہ بحث سے متعلق ہوتا ہے' میڈیا مختلف قسم کی آراَ اور نقطہ ہائے نظر جاری کرتا ہے' لیکن جب ایک نقطہ نظر اختیا رکرتے ہیں اور اسے آگے جاری کرتے ہیں تو آپ اس سے بحث نہیں کرسکتے 'یہاں کوئی مسابقت نہیں ہوتی' بحث کرنے کے لیے آپکو خود سے الگ ہونا پڑے گا...... میں کو الگ کرنا پڑے گا...... اپنے موَقف کا موازنہ کرنا پڑے گا' یہ دراصل آپ کا کسی اور کے جوتے پہننا ہوگا' ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خیالات کی مینجمنٹ دراصل بحث کا حاصل ہے' بحث میں جتنا ہم شامل ہوں گے اتنی معاملے کی بنیاد وسیع ہوتی چلی جائے گی' اگر دنیا کی تہذیبیں خود کو محصور سمجھیں اور اگر مشترکہ علم کی کمی سے اس میں شدت پیدا ہوتی ہے تو ہمیں سقراطی دانائی کی منزل کے حصول کے لیے بحث و تنقید کے عمل کو مزید جامع بنانا ہوگا۔ مکالمہ صرف تنوع کا معاملہ ہے نہ مختلف نقطہ ہائے نظر کا سنگم بلکہ اسے مزید جامع بنانا ہوگا۔ یہ اجتماعیت پر مبنی نہیں بلکہ مکالمہ آمیز ہونا چاہیے۔ یہ ایک خواب ہی لگتا ہے لیکن کیا ہی اچھی بات ہوگی اگر لوگ اپنے اختلافات کو زبانی طور پر دور کرلیں اور اختلافات محض کتابی چیز بن جائیں۔

کوئی بھی ان سماجی حقائق سے صرف نظر نہیں کرسکتا کہ ہر کسی کے مفادات مختلف ہوتے ہی اور ان کے پہلو بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ اکثر اختلافات ہی ہوتے ہیں جو ہمیں عمل کے لیے مجبور کرتے ہیں جب معاشرتی سرگرمیوں کے لیے متبادل اقدامات سے دامن

چھڑانا ضروری ہوتو یہ عمل فریقین کے درمیان تعلق کی تقسیم سمجھا جائے' اس پر دلائل دینا اس حوالے سے اہم ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس قسم کا اختلاف اس تنوع سے کہیں زیادہ مختلف ہوتا ہے جسے میں تقسیم قرار دیتی ہوں۔ تقسیم سے ہمیشہ اچھے نتائج برآمد نہیں ہوتے' دشمن اس وقت تقسیم ہوجاتے ہیں جب وہ اپنے اہداف میں اختلاف کا شکار ہوتے ہیں۔ ترقی یافتہ اور ترقی پذیر دنیا میں مخروطی تقسیم ایک دوسرے پر انحصار کی عکاس ہوتی ہے' لہٰذا تقسیم بذات خود کوئی قابل قدر چیز نہیں۔

کوئی بھی اختلاف ختم کرسکتا ہے کہ اسے ایسا کرنا چاہیے۔ ہاں اس کے ساتھ کام ضرور کیا جاسکتا ہے' اس کا سبق مجھے پاپوانیوگنی سے ترک وطن کر کے پورٹ مورس بی آنے والے افراد نے دیا۔ تارکین وطن اس نئے شہر میں جاتے ہیں جہاں ہر کوئی اجنبی ہوتا ہے اور ان دونوں میں شاید ہی کوئی مشترک اقدار ہوں۔ تاہم یہی وہ کیفیت ہے جو لوگوں سے بھری دنیا سے وابستہ ہونے کی تحریک دیتی ہے اور مکالمے کا رستہ نکلتا ہے۔

باب13

حدود و امتیاز سے پاک کائناتی زبان

روی شنکر (ستار نواز)

یہ جان کر حیرت ہوئی کہ دنیا کی بڑی بڑی شخصیات انسانوں کے درمیان تصادم کے عنوان پر مضامین لکھ رہی ہیں اور مجھے بھی اس میں حصہ ڈالنے کے لیے کہا گیا ہے اور اس سے بھی زیادہ میں اس بات پر حیران تھا کہ میں کیسے مضمون کا آغاز کروں' کیونکہ موسیقار کی حیثیت سے صرف موسیقی ہی میرا بڑا ذریعہ اظہار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں یہ مضمون بھی اپنی زبان موسیقی کے بارے میں لکھوں گا۔

ہزاروں سال پہلے جب انسان نے کھانا پکانے کے لیے آگ جلانا ' شکار کرنے کے لیے ہتھیار بنانا' بچاؤ کے لیے کپڑے تیار کرنا' فصلوں کی کاشت کرنا اور ہل چلانا سیکھنا شروع کیا تو اس نے پرندوں کی نقل کرنا اور ان کی ستائش کرنا بھی سیکھا' اور اپنی آواز کے ذریعے گانا گانا بھی سیکھا۔ وہ مسرت کے مواقع اور تقریبات میں پاؤں زمین پر مار کر رقص کرتا اور خوشی محسوس کرتا۔ اس نے اپنے اردگرد جو کچھ دیکھا اسے غاروں کی دیواروں پر کندہ کر دیا۔ آہستہ آہستہ ڈھول' سارنگی اور طبلے جیسے آلات موسیقی خام حالت میں وجود میں آئے' یہ بات کتنی خوش کن تھی کہ یہ صرف انسان تھا جس نے تخلیق اور ایجاد کرنا سیکھا اور باقی کوئی مخلوق ایسا نہیں کر سکی۔

اس وقت انسان کے اندر ایک قسم کے ڈر نے جنم لیا اور اس نے سورج' آگ اور فطرت کی دیگر بڑی قوتوں کی پوجا شروع کر دی' اس نے بتدریج عمارتیں' سڑکیں' آبپاشی کا ڈھانچہ بنانا اور زراعت کا ہنر سیکھا' اس کے علاوہ کپڑے بُننا' زیورات تیار کرنا اور بولنے دیکھنے کے لیے زبانوں کو ترقی دینا سیکھ لیا گیا' لیکن سب سے زیادہ اہم یہ ہے کہ اس نے (مضمون نگار کی زبان میں) خدا

''ایجاد'' کیا' یوں کئی قسم کے مذہب اور عقائد دنیا کے مختلف علاقوں میں وجود میں آئے۔ پہلے بت پرست اور عبادت کرنے والے پھر زیادہ بہتر شکل میں فلسفیانہ اور روحانی...... جیسا کہ ہم چین' ہندوستان' مصر' یونان' روم اور دیگر مقامات پر تہذیبوں کی انتہائی ترقی کے بارے میں جانتے ہیں۔

ان پیشرفتوں کے بعد ایڈجسٹمنٹ کی ضرورت کی دریافت ہوئی' میری ستار پر ہر تار کو اچھی Tuning کی ضرورت ہے' اگر ہر تار کی تان اچھی ہے تو مدھر موسیقی وجود میں آئے گی' تان بے ترتیب ہوگی تو بے سر پیر موسیقی بجے گی۔ ہر شخص کو کسی اور کی تان بہتر کرنے سے پہلے اپنی تان ٹھیک کرنا چاہیے۔

ایک قابل لیڈر اپنے بے بہا خیالات اور صلاحیت سے ایک عظیم کام اس محبت کے ساتھ انجام دے سکتا ہے جو اسے ملتی ہے اور وہ محبت جو وہ دیگر لوگوں کو دیتا ہے۔ ہمیں انسانی تاریخ میں ایسے چند ہی عظیم لیڈر ملتے ہیں لیکن بدقسمتی سے ان میں سے اکثر آمر بنتے چلے گئے' دولت اور اختیار کی ہوس نے انہیں بے رحم بنا دیا اور انہوں نے وہ سب کچھ برباد کر دیا جو اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔

یہ بات بالکل عیاں ہے کہ ٹیکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے آج ایک عام شخص کو بھی انٹرنیٹ اور ٹی وی سے اطلاعات اور تفریح کے ذریعے پہلے سے کہیں زیادہ فائدہ پہنچ رہا ہے۔ بڑے سماجی مفکرین حیران ہیں کہ یہ اچانک تبدیلیاں ہمیں کس طرف لے جائیں گی' بالخصوص ہماری نئی نسل کے ساتھ کیا ہوگا۔

ایسی تبدیلی کا تجربہ ہر نسل نے اپنے اپنے دور میں کیا' میں نے خود ایسا امریکہ اور برطانیہ میں ہوتے دیکھا' زیادہ تر تبدیلی کا یہ عمل 1960ء کے عشرے میں نظر آیا۔ معاشرے کی روایات سے باغی Beatniks بھی وہاں پائے جاتے تھے' ان میں سے زیادہ تر کی عمریں 35 سال سے اوپر تھی۔ مصنفین' مصوروں' موسیقاروں' اداکاروں اور دیگر ایسے لوگوں پر مشتمل گروہ کے ارکان مصروف اور کامیاب افراد تھے' انہوں نے نشے کا تجربہ بھی کیا' اس کے بعد شاعری پڑھنے کا دور آیا' پھر روایتی گانوں اور کلبوں کے وقت کا آغاز ہوا' جب یہ سب کچھ شروع ہوا تو نوجوان لڑکے اور لڑکیاں قافلے میں شامل ہوگئے' انہوں نے داڑھیاں اور بال بڑھائے۔ بے ڈھنگے لباس پہنے اور بھنگ کی بدبو چھپانے کے لیے تیز عطر کا استعمال کیا گیا' ان میں سے کئی تیز قسم کے کیمیکلکے بھی عادی تھے۔

برطانیہ اور امریکہ میں میرے ایجنٹوں نے بالترتیب 1966ء اور 1967ء میں فوک کلبوں میں پرفارمنس کے لیے میری بُکنگ کی' جہاں پہلی بار مجھے معاشرے کے ان کرداروں سے آگاہ ہونے کا موقع ملا' وہ مجھے کسی اور سیارے کی مخلوق نظر آئے۔ اگرچہ انہوں نے میرے ساتھ بڑی چاہت اور خلوص کا اظہار کیا لیکن میں زیادہ خوش نہ ہوا' میں نے اپنے آلات موسیقی اور شخصیت کی توہین محسوس کی' اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے موسیقی کی تربیت اپنے گرو بابا علاؤالدین سے حاصل کی' جو روحانیت پرمبنی روایات سے منسلک تھے اور منشیات وشراب کے مخالف تھے۔

اگرچہ مجھے 1956ء کے بعد سے خاصی مقبولیت حاصل ہو چکی تھی اور میں یورپ و امریکہ کے ممتاز ہالوں میں فن کا مظاہرہ کرتا رہا لیکن جب جارج ہیریسن 1966ء میں میرے شاگرد بنے تو نوجوانوں میں میری مقبولیت کا گراف بہت اوپر چلا گیا' نوعمرافراد مجھے پاپ سٹار کے طور پر پسند کرنے لگے اور مجھ سے محبت کرتے' اوپن ایئر مقامات پر جب میں پرفارم کرتا تو اپنے سامعین میں سے اکثر کو پتھرائے ہوئے ''ہپی'' دیکھ کر اداس ہو جاتا' وہ ایک غیر شائستہ اور جوشیلے نوجوان ہوتے اور پاپ یا راک محافل موسیقی میں زبردست دلچسپی لیتے۔ ایسے مواقع پر وہاں اگر بتیاں جلا کر روحانی بھارت کے انداز میں ماحول کو خوشبودار بنایا جاتا۔

1967ء سے 1973ء کے ان برسوں کے دوران موسیقی کی محفلوں' ٹی وی' ریڈیو اور جرائد میں اکثر نوجوانوں سے کہا کرتا کہ مجھے منشیات کے عادی لوگ پسند نہیں' بالخصوص نشے کو موسیقی' یوگا' مراقبے اور زندگی کے ایسے کسی سنجیدہ معالے سے منسلک کرنا مجھے ناگوار گزرتا ہے۔ میں انہیں کہتا تھا کہ کسی کو شراب نوشی نہیں کرنی چاہیے اور نشے کی حالت میں چرچ یا محفل موسیقی میں جانے سے گریز کرنا چاہیے۔ مسرت و انبساط کے لیے جو چاہیں کریں لیکن زندگی کی اعلیٰ اور بیش قیمت اقدار کا خیال رکھا جائے اور انہیں منشیات کے ساتھ نتھی نہ کیا جائے وہاں جو لوگ موسیقی سننے آتے تھے وہ بھارت کی روایتی موسیقی کے اس طرح مداح تھے جیسا کہ آج بھی پوری دنیا میں موجود ہیں۔ وہ دن گئے جب مغرب میں موسیقی کی دھنیں بکھرتے ہی لوگ تالیاں بجانا شروع کر دیتے' وہ طبلے کے دائیں طرف پڑے ڈرم کو موسیقی کا آلہ سمجھ کر اسے ہتھوڑی سے بجا کر دیکھتے تھے۔

میں یہاں بھارتی موسیقار کی حیثیت آیا اور اپنے ملک کی عظیم موسیقی کو باقی دنیا سے متعارف کرانے کا خواہاں تھا۔ شروع شروع میں یہ ایک مشکل کام ثابت ہوا' لیکن میرے جذبے اور لگن اور موسیقی کی روحانیت سے میں نے محسوس کیا کہ میری موسیقی اب کئی دلوں پر اثرانداز ہوسکتی ہے۔ ہندوستانی موسیقی دانشورانہ' روحانی اور جذبات کے لحاظ سے ایک عظیم قوت ہے' میرے لیے یہ بات باعث مسرت وافتخار تھی کہ یہودی مینوہن' جین پائرے رامپال' جان کولٹرین' جارج کولٹرین' جارج ہیرلیسن' فلپ گلاس' بڈی رچ' پالر ہارن' بڈشینک او ہوسن یاماموتو اور موسومی جیسے موسیقاروں نے مجھ سے سیکھا یا مجھ سے بہت متاثر تھے۔ مجھے آندرے پریوین کے ساتھ 1970 میں اور زوبین مہتہ کے ساتھ 1980ء میں ستار کنسرٹ میں حصہ لینے کا بھی موقع ملا۔

دنیا بھر میں میرے سمیت مختلف تجربات سے یہ بات ہوچکا ہے کہ موسیقی کے استعمال سے دنیا کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ بلڈ پریشر کم رکھا جاسکتا ہے' حتیٰ کہ موسیقی سے جانوروں کا رویہ بھی بہتر ہوجاتا ہے۔ یہ میری خواہش ہے کہ دنیا کے ہر کونے میں سکولوں میں موسیقی کو متعارف کرایا جائے۔ یہ ہر بچے کا حق ہے کہ وہ موسیقی سے بہرہ ور ہوسکے' کیونکہ اس طرح ان کی صلاحیتیں مثبت طور پر زیادہ بہتر ہوسکتی ہیں۔ اس حوالے سے ہم دہلی میں ایک سنٹر قائم کرنے کوشش کررہے ہیں۔

میرا یہ پختہ یقین ہے کہ اگر دنیا کے سیاسی رہنما اور مقتدر افسر موسیقی سے تھوڑا سا بھی شغف رکھیں تو دنیا میں خون خرابے میں کم آئے گی اور ہم آہنگی بڑھے گی۔ موسیقی حدود و قیود کے بغیر ایک عالمی زبان ہے' میں نے اس زبان کے استعمال کے ذریعے لوگوں سے مخاطب ہونے کی کوشش کی اور ان کے ذہن' دل اور تصورات کو متاثر کیا۔ یہ سب میرے اندر بھارتی روحانیت کے باعث ممکن ہوسکا۔ موسیقی میں زخم بھرنے اور انسانی روح کے درجے میں اضافے کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے اور اس سے امن لایا جاسکتا ہے۔ میں ممنون ہوں کہ مجھے ان مقاصد کے حصول کے لیے اپنا حصہ ڈالنے کا موقع دیا گیا' اگر میری موسیقی سے کوئی مثبت اثر پڑا ہے اور کسی کو مسئلے کے حل میں مدد ملی ہو یا کوئی محبت وحسن کا پیغام آگے پھیلا سکا ہو تو پھر ایک بہتر دنیا کا میرا تصور حقیقت بن سکتا ہے اور یہ کہ موسیقی ایک ناگزیر اور خوبصورت مکالمہ ہے۔

باب14

تہذیبوں کے مابین مکالمہ

کوفی عنان

اقوام متحدہ کا قیام اس عقیدے کی بنیاد پر عمل میں لایا گیا کہ مکالمہ بدامنی پر غالب آ سکتا ہے اور تنوع ایک کائناتی نیکی ہے اور یہ کہ دنیا کے عوام اپنی منقسم شناختوں سے قطع نظر مشترکہ سمت کے لیے زیادہ بہتر انداز میں متحد ہو سکتے ہیں' یہ ایک بڑا مقصد ہے' کیونکہ آخر کار تمام تہذیبیں اور ثقافتیں تاریخی طور پر جامد حقائق کی حامل نہیں بلکہ ان میں وقت کے ساتھ' ساتھ تبدیلیاں آتی گئیں اور ایک کلچر نے بسا اوقات خود کو دوسری تہذیب میں مدغم بھی کر دیا۔ اسی طرح ان تہذیبوں کا مخصوص مذہبی عقیدے سے متفق ہونا بھی ضروری نہیں۔ یہ بات بالکل غیر اہم ہوگی اگر ہم کسی تہذیب کو عیسائی 'اسلامی یا بدھ تہذیب قرار دیں' ایسا کرنے سے محض ایسی دیواریں ہی کھڑی کی جاسکتی ہیں جن کے اندر کسی کے وجود کی گنجائش نہیں ہوتی۔

اصل میں تہذیبوں کو عمومی حیثیت دینا آج کے جدید دور میں پذیرائی حاصل نہیں کرسکتا' مائیگریشن' رابطے اور ٹیکنالوجی مختلف نسلوں' تہذیبوں اور لسانی گروپوں کو قریب لا رہی ہے' ہم ماضی کے برعکس کئی قسم کے اثرات کی پیداوار ہیں' پرانی رکاوٹیں ختم ہو رہی ہیں اور نئی حقیقتیں جنم لے رہی ہیں۔ آج ہم ماضی کے برعکس غیر ملکیوں اور شناسا دونوں طرح کے لوگوں کے ساتھ رہ رہے ہیں۔

میرے کہنے کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ ہم اپنے مخصوص ورثے اور عقیدے پر بجا طور پر فخر نہیں کرسکتے' ہم ایسا کر سکتے ہیں اور ہمیں فخر کرنا بھی چاہیے' لیکن یہ خیال کہ جو کچھ ''ہمارا'' ہے وہ لازمی طور پر ''انکے'' ساتھ متصادم ہے بالکل غلط اور خطرناک ہے۔ جو کچھ ہمارا ہے ہم اس کے ساتھ اسی طرح محبت کر سکتے جو ہمارا ہے تو پھر تہذیبوں کے درمیان مکالمہ کسی طرح سے ایک مفید تصور ہوسکتا

ہے؟ اول' یہ تہذیبوں کے ناگزیر تصادم کے تصور کا مناسب اور ضروری جواب ہے' وہ ایسے کہ یہ تعاون میں پیشرفت کے لیے پہیے کا کام کرتا ہے۔ دوم اور سب سے اہم یہ کہ مکالمہ جھوٹ اور حقائق کا فرق واضح کرتا ہے اور زبانی تجزیے کے پراپیگنڈے کا توڑ ہے۔ اس سے تنازعے کی تہہ میں موجود حقیقی مسائل کی نشاندہی میں مدد ملتی ہے۔

خطہ بلقان میں حالیہ عشرے میں تاریخ کا مزید تقسیم اور تنازعے کے لیے استعمال اور غلط استعمال ایک المناک مثال کے طور پر ہمارے سامنے ہے۔ وہاں صدیوں میں رائج تہذیبوں کے مابین مکالمے کے سنہری اصول کو یہ تشدد دینے سے تباہ کردیا گیا۔ اچانک بوسنیا کے مسلمانوں کو ''ترک'' کہا جانے لگا اور ان پر حملوں کو یہ کہہ کر جائز قرار دیا گیا کہ ترکوں کے آباؤ اجداد نے یہی کچھ 500 برس قبل ہمارے ساتھ کیا تھا' ان حالات میں تاریخ' کلچر اور مذہب کی واضح طور پر سمجھ سے کمیونزم سے جمہوریت کو انتقال اقتدار اور حقوق وفرائض کے مسائل کو کثیر النسلی ماحول کی بنیاد پر مشترکہ احترام کے ذریعے حل کیا جاسکتا تھا۔

اس سے زیادہ مشرق وسطیٰ میں تین بڑے مذاہب کے لیے مقدس سرزمین پر مذہبی اختلافات کی بنیاد پر مملکت' قومیت اور ملکیت کے حساس ایشو جڑ پکڑ چکے ہیں' جو تنازعہ پہلے قوموں کے مابین قضیہ تھا اب مذہبی مسئلہ بھی بننے کے خطرے سے دوچار ہے' لہٰذا مکالمہ اب نام نہاد تہذیبی اور مذہبی سوال کے حل میں مدد دے سکتا ہے' امن کو سیاسی اور ریاستی سمجھوتوں سے جنگ پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔

میں یہاں یہ نہیں کہہ رہا کہ سکیورٹی' حق خودارادیت اور وقار کے خطرے میں پڑنے کا کوئی مسئلہ سرے سے موجود نہیں۔ لیکن الفاظ کا مکالمہ اور عملی اقدامات دوسرے فریق کے مصائب کے ادراک کے ذریعے حقیقی معنوں میں امن اور تبدیلی کا پیش خیمہ بن سکتے ہیں۔ ہم قانونی طریقے' تعلیم' معاشی اور سماجی ترقی سے عدم برداشت کے خلاف لڑائی کو مؤثر بنانا چاہتے ہیں' اور ہم یہ سب کچھ اس سے پہلے کرنا چاہتے ہیں جب مسائل اور زیادتی قابو سے باہر ہوجائیں اور لوگ خود کو میدان جنگ میں موجود پائیں۔ لوگ تنازعات میں لڑائی چاہتے ہیں نہ اس کے متحمل ہوسکتے ہیں۔ عدم برداشت پوری دنیا میں وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہے' لیکن ہمارا چیلنج صرف مرض کی تشخیص

نہیں بلکہ ہمیں اس کا علاج بھی کرنا ہوگا۔ہم امتیازی سلوک کو انسانی جبلت کا ناگزیر پہلو کہہ کر نظرانداز نہیں کر سکتے' جس طرح لوگوں کو نفرت کرنا سکھایا جاسکتا ہے بالکل اسی طرح انہیں دیگر افراد سے عزت و احترام کے ساتھ پیش آنے کی بھی تعلیم دی جاسکتی ہے۔ ہم عدم رواداری کو محض غربت' ناانصافی' بدانتظامی کا نتیجہ قرار دے کر قبول نہیں کر سکتے' نہ ہی ہم اشتعال انگیز لہجے کو یہ کہہ کر اپنا سکتے ہیں کہ اس سے بہت کم فرق پڑے گا' جارحانہ انداز اکثر جارحانہ اقدام پر منتج ہوتا ہے اور جارحانہ اقدامات تشدد' تصادم اور بدترین نتائج کا باعث بنتے ہیں۔

ہم سب کو اس جنگ میں شامل ہونے کی ضرورت ہے۔حکومتوں کو یہ بات یقینی بنانی چاہیے کہ آئینی' قانونی اور انتظامی ضمانتیں مہیا کی جا رہی ہیں کیونکہ یہ سب عدم رواداری کے مسئلے کے پھیلاؤ کو روکنے کا باعث بنتی ہیں۔اس کی مثال بیروزگاری ہے'صدور اور وزرائے اعظم کو ان ایشو پر قومی سطح کے مکالمے کے لیے قیادت کرنی چاہیے۔

یقیناً تعلیم کا اس میں مرکزی کردار ہے لیکن تعلیم صرف سکولوں کا معاملہ نہیں' کچھ ممالک نے امیگریشن والے صحافیوں کو قومی سطح کے مواصلاتی اداروں میں ملازمتیں دی ہیں' کاروباری برادری بھی عوامی آگاہی میں کردار ادا کرسکتی ہے اور تعلیم کا آغاز گھر سے ہونا چاہیے۔ بہرحال یہ کچھ وہاں وقوع پذیر ہوا جہاں نسلی تفریق کی بُرائی پائی جاتی ہے۔

اس جدوجہد میں عالمی سطح پر ایک واضح زاویہ ہے' اقوام متحدہ کے معاہدے (Treaty) اکثر قومی قوانین کی اساس بنتے ہیں۔ ہمارے ترقیاتی کام' قیام امن کی سرگرمیاں' انسانی حقوق کے پروگرام اور انسانی بنیادوں پر امداد سب میں برابری کو بنیادی جز کی حیثیت ہے۔موجودہ دور میں ایک اہم کام روانڈا اور سابق یوگوسلاویہ میں جنگی جرائم کی سماعت کے لیے انٹرنیشنل کریمنل ٹربیونل کا قیام ہے۔نسل کشی' زیادتی اور انسانیت کے خلاف جرائم میں سزاؤں کے ذریعے ہم نے جارحیت کے خلاف احتساب کا اہم اقدام اٹھایا ہے۔

دنیا میں تہذیبوں' ثقافتوں اور گروہوں کی رنگا رنگی کے ساتھ ساتھ میں ایک عالمی تہذیب کا بھی قائل ہوں جس کو نئی صدی کے آغاز میں فروغ ملنا چاہیے۔ اس عالمی تہذیب میں انسانی حقوق ' آزادی' اختلاف پر برداشت اور اظہار رائے کی آزادی پر زور دیا جانا چاہیے۔ یہ ایک ایسی تہذیب

ہو جس کا تنوع خوف سے پاک اور خوش آئند ہو' درحقیقت کئی جنگیں لوگوں کے اس خوف سے جنم لیتی ہیں جو ان کے ذہن میں دیگر طبقات کے لیے پایا جاتا ہے' صرف مکالمے سے ایسے خدشات پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

اقوام متحدہ ایک ایسا بہترین پلیٹ فارم ثابت ہوسکتی ہے جہاں تہذیبوں کے مابین مکالمہ پھل پھول سکتا ہے اور انسانی دلچسپی کے ہر شعبے میں اس کے ثمرات ظاہر ہوسکتے ہیں' بلاشبہ اقوام متحدہ کی تاریخ میں سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ روزمرہ کے معمولات میں مکالمے' قوموں کے اندر اور بین الاقوامی مذاکرات کے بغیر امن دیرپا ہوسکتا ہے اور نہ کوئی ترقی و خوشحالی محفوظ ہوگی۔ اگر کسی کو تہذیبوں کے درمیان مکالمے پر کوئی شک ہے تو انہیں یہ شک زیادہ قائم نہ رکھنے دیا جائے۔ 11 ستمبر کے حملوں نے ایسے مکالمے کی ضرورت کو شفاف تر بنا دیا ہے۔

میں یہ نہیں کہہ رہا کہ مکالمہ کا عمل آسان ہوگا' لیکن ہمیں مشکلات کو رکاوٹ بننے سے روکنا ہوگا۔ میرا ایمان ہے کہ ہم اس سے عام آدمی کی زندگی میں حقیقی تبدیلی لاسکتے ہیں' اور یہ ایک ایسا معیار بن جائے گا جس سے مکالمے کی پیمائش ہوسکے گی' اور اس میں آنے والی نسلوں کے بنیادی حقوق کا تحفظ کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔

آج کے درپیش چیلنجوں سے قطع نظر مکالمے کا ایک مقصد اور اہمیت ہے۔ ایسے مکالموں سے تاریخ کے دوران سمجھوتے اور مفاہمت کی راہ ہموار کی جاتی رہی ہے اور یہی آج کی باہم مربوط دنیا میں ہوسکتا ہے' اس سے امن برقرار رکھنے کی ہر کوشش کو تقویت مل سکتی ہے' اور قوموں کے اندر اور قوموں کے درمیان تنازعوں کے حل کی کوشش کی جاسکتی ہے۔

مجھے امید ہے کہ آنے والے مہینوں اور برسوں میں تمام ممالک اس مکالمے میں شامل ہو جائیں گے اور ہماری دنیا کے محروم اور کمزور طبقات کی خدمت کے لیے مکالمے کو حقیقی معنوں میں رائج کریں گے' وہ طبقات جو عدم رواداری' تعصب اور نفرت کا شکار ہیں' ہمیں ان کے لیے قوموں کے درمیان مکالمے کی حمایت کرنا چاہیے۔

باب15

مصائب کی مفید نشاندہی

لارڈ جارج کیری

ہماری دنیا ایک عظیم خطرے سے دوچار ہے' میں یہاں ماحولیات' پریشان کن غربت یا عالمی معیشت کے ایشوز پر روشنی نہیں ڈال رہا جن میں سے ہر ایک مسئلہ ہماری چھوٹی سی دنیا کے مستقبل کے لیے بڑے مباحث کو جنم دیتا ہے' اسکی بجائے میں اس شدید نظریاتی کشیدگی پر تبصرہ کر رہا ہوں جو مغرب کو دیگر دنیا' یا وہ ''اسلامی'' دنیا کہہ لیں سے الگ کرتا ہے جو میرے نزدیک اسلام کی حقیقی اقدار کی عکاسی نہیں کرتی' کچھ عرصہ قبل میں نیویارک میں اس مقام پر قیام پذیر تھا جو سابق ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی جگہ سے دو بلاک کے فاصلے پر تھا۔ 11 ستمبر کے حملوں کے بعد اس جگہ کا دورہ اداسی کے گہرے احساس کے بغیر ممکن نہیں' لیکن مجھے ملنے والے ہر امریکی کا خیال تھا کہ دیگر ''اسلامی'' دہشت گرد امریکہ کو سزا دینے کے لیے ایسا ہی کوئی اور حملہ کریں گے۔ ''اسلام'' کے لفظ کو دہشت گردی سے جوڑنا ایک پریشان کن امر ہے' لیکن جو کوئی مشرق وسطیٰ کا سفر کرتا ہے تو اسے وہاں مختلف قسم کا تاثر نظر آتا ہے۔ وہاں مغرب کو جارح' بدعنوان' مادہ پرست اور مذہب سے عاری سمجھا جاتا ہے۔

ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کے بعد اخبار ''فنانشل ٹائمز'' نے 27 فروری 2002 کو 9 اسلامی ممالک پاکستان' سعودی عرب' انڈونیشیا' مراکش' ایران' کویت' ترکی اور لبنان کے 10 ہزار افراد پر مشتمل ایک منفرد سروے کا اہتمام کیا' جس سے انکشاف ہوا کہ ان ممالک کے لوگ مغرب بالعموم اور امریکہ کے بارے میں بالخصوص گہری تشویش رکھتے ہیں۔ امریکہ کو بے رحم' جارح' دھوکہ باز' بدلحاظ' زود اشتعال اور خارجہ پالیسی کے لحاظ سے انتہائی متعصب ملک سمجھا جاتا ہے۔ سروے میں حصہ لینے

والوں کی اکثریت کا خیال تھا کہ ''مغربی اقوام عرب اور اسلامی اقدار کا احترام نہیں کرتیں' وہ عرب کاز کی حمایت کرتی ہیں' نہ عربوں کے لیے اچھے سلوک کا اظہار کرتی ہیں۔'' اگرچہ اکثر لوگوں نے 11 ستمبر کے حملوں کی مذمت کی تاہم قابل ذکر تعداد میں ان افراد نے یہ دعویٰ مسترد کر دیا کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ عربوں بالخصوص اسامہ بن لادن کے نیٹ ورک نے کیا بلکہ اس کے پیچھے اسرائیل کا ہاتھ ہے جو حملوں کی آڑ میں عربوں پر الزام لگوانا چاہتا ہے' دلچسپ امر یہ ہے کہ ایک بڑی تعداد میں لوگوں کا یہ یقین تھا کہ 9/11 کے حملوں کی منصوبہ بندی خود امریکہ نے کی لیکن کسی نے یہ نہیں بتایا کہ آخر امریکہ کے یہ کام کرنے کے پیچھے کون سے محرکات یا عزائم تھے۔

جہاں تک مغرب کا تعلق ہے' وہاں اس جیسے کسی سروے کے نتائج کے مجھے علم نہیں' اپنے تجربے سے گزشتہ کئی سال میں جو جانتا ہوں وہ یہ ہے کہ مغرب میں ''اسلاموفوبیا'' کی جڑیں گہری ہوتی جا رہی ہیں' برطانیہ میں کئی گوروں کا خیال ہے کہ مسلمان ''ہمارے'' ملک پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور اگر ہم نے انہیں بڑی تعداد میں ملک میں آنے دیا تو ایک وقت میں وہ برطانیہ کو اسلامی ملک میں تبدیل کر دیں گے' ایسی تشویش کو بکواس قرار دے کر مسترد کرنے سے خدشات ختم نہیں ہوتے کیونکہ ان کے ذہن میں یہ خیال اتنا راسخ ہے جتنا کہ مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ سیکولر مغرب گلوبلائزیشن کے ذریعے بے رحمانہ طریقے سے اپنے مفادات حاصل کرنا چاہتا ہے' اور اسلامی اقدار اور معاشروں کو مغربی کلچر اور میڈیا کے ذریعے تباہ کرنا چاہتا ہے۔

اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ ہم ایک جیسی پریشانیوں' خوابوں اور خوف کا شکار ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ہم تلخ تنازعے اور نسلی یادوں کو مدنظر رکھ رہے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ہم ماضی کے معاملات میں الجھے ہوئے ہیں۔

اول' مسلمانوں میں مغرب کے فریب اور منافقت سے شدید غم وغصہ پایا جاتا ہے' کیونکہ ان کے نزدیک مغرب اسلامی ثقافتوں اور مذہب کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔ عیسائیوں کے نقطۂ نظر سے یہ بات تباہ کن ہے کہ مغربی اقدار کو اس انداز میں دیکھا جاتا ہے کیونکہ مغرب عیسائی اقدار اور روایت کا حامل ہے' اس بات میں بہت کم شبہ ہے کہ یہ اقدار وہی ہیں جو حضرت عیسیٰؑ پر نازل انجیل مقدس میں پیش کی گئی ہیں' عیسائیوں کو گہرا افسوس ہے کہ مذہبی عقائد پر عمل پیرا نہ ہونے سے کئی مغربی شہری اس

ضابطہ اخلاق سے دور ہو جائیں گے جو مذہبی تعصب' خود غرض اور فلسفہ مسرت کے حاوی جذبات کے آگے بند باندھتا ہے' میرے ایک مسلمان دوست ڈاکٹر عبداللہ رابن نے مجھے ایک کھلے خط میں لکھا کہ ''غیر یقینی اور شک مغربی کلچر کی مابعد جدیدیت خوبیاں ہیں جس کا کوئی اخلاقی جواز نہیں۔ میں کافی حد تک ان کے اس مؤقف سے اتفاق کرتا ہوں' ہاں میں ناقدین کو یہ دلیل ضرور دوں گا کہ مغربی لوگوں کی اکثریت چاہے وہ مذہبی ہے یا غیر مذہبی اچھے اچھے خیالات کی حامل ہے اور اچھی زندگی بسر کرنے کی خواہاں ہے' امریکہ کا گاہے بگاہے دورہ کرنے والے شخص کے طور پر میں امریکیوں کا بہت احترام کرتا ہوں' ممکن ہے وہ عیسائیت کے اخلاقی معیارات پر پورے نہ اترتے ہوں لیکن مستحکم کمیونٹیوں کے قیام اور بقائے باہمی کی ان کی خواہش پر کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا' ہم دنیا کے کئی حصوں کی ترقی کے لیے امریکی کردار کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتے۔ ہمیں مغرب کو یہ یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ ان کا اثر ونفوذ اور مادیت پرستی انسانی روح کے لیے غربت اور محرومی جیسا خطرہ ہے۔ امریکی برطانوی شہریوں کی بہ نسبت زیادہ عیسائی نہیں' میں یہ کہتا ہوں کہ مسلمان' یہودی' عیسائی' ہندو اور دیگر عقائد کے لوگ درپیش چیلنج سے متحد ہو کر نمٹیں اور یہ ظاہر کریں کہ ہم سب ان اقدار پر عمل پیرا ہیں جو ہمارا قیمتی اثاثہ ہیں۔

روم کی جارجین یونیورسٹی میں ایک لیکچر کے دوران مجھے مسلمانوں کی ایک اور محرومی پر اظہار خیال کا موقع ملا' اس کا تعلق جمہوریت' عقیدے کی آزادی اور انسانی حقوق سے میری وابستگی سے تھا' میں نے سوال کیا تھا: ''مسلمان ممالک بالخصوص مشرق وسطیٰ میں جمہوریت کی تابنا کی کیوں نہیں پائی جاتی؟

آیئے جمہوریت کے ایشوز اور سیاسی تحفظات کی تشکیل کرنے والی اقدار کا زیادہ پرمغز جائزہ لیں' ونسٹن چرچل نے جمہوریت کے بارے میں کہا تھا کہ ''یہ ماسوائے دیگر نظاموں کے بدترین نظام حکومت ہے۔'' It was the worst system of government except for all the others. بلاشبہ چرچل کی طرف سے جمہوریت کی اس ایماندارانہ تعریف کا مطلب یہ ہے کہ جمہوریت کو توڑ مروڑ کر بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ نازی جرمنوں نے جمہوریت کو بدترین شکل میں پیش کیا' دنیا کے انتہائی ترقیاتی ملک جرمنی میں ہٹلر نے جمہوری طور پر منتخب حکومت

قائم کی اور پھر خود اس کو غیر منصفانہ اور شیطانی اقتدار کے لیے تباہ و برباد کر دیا' لہٰذا اگر میں یا دیگر لوگ ایسی جمہوریت کا فروغ چاہتے ہیں جہاں اقدار پھلے پھولیں اور علم و سائنس کا دور دورہ ہو تو مجھے یہ بحث کرنی چاہیے کہ اس زمین پر ان چیزوں کا فقدان آخر کیوں ہے؟ مجھے مسلمان ملکوں کو جمہوریت سے دوری کا ذمہ دار کیوں ٹھہرانا چاہیے جبکہ شواہد ثابت کرتے ہیں کہ جمہوری طور پر منتخب ہونے والی مغربی حکومتیں اکثر عوام یا پارلیمنٹ کے سامنے قابل احتساب نہیں ہوتیں۔

ایسے سوالات کا جواب ہماری جمہوریت کے لیے سوجھ بوجھ سے منسلک ہے اور جیسا کہ امریکہ کے ممتاز فلسفی اور قانون دان رونلڈ ڈورکن کے مطابق ہمیں اکثریتی اور عقابیEgalitarian جمہوریت میں تمیز سمجھنا ہوگی۔(1) یہ ایک ایسا طرز حکومت ہے جس میں فیصلے عددی گنتی کی بنیاد پر کیے جاتے ہیں۔مثال کے طور پر ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ایک موٹروے کا راستہ انتہائی خوبصورت وادی میں سے گزارا جائے کیونکہ لوگوں کی اکثریت اس کا مطالبہ کر رہی ہے' ڈورکن کے نزدیک اس قسم کا فلسفہ قانون کے سامنے تمام شہریوں چاہے وہ اقلیت میں ہوں کے برابر ہونے کی نفی ہو سکتا ہے۔دوسری طرف عقابی جمہوریت میں تمام شہریوں کو برابر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور ان کے حقوق کو قوانین اور وساتیر میں تحفظ دیا جاتا ہے' اقلیتوں کو اکثریت کی طرف سے حقوق کی خلاف ورزی سے روکا جاتا ہے' یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ اقلیت محض اس بناء پر اکثریت کو یرغمال نہیں بنا سکتی کہ وہ ایک اقلیت ہے اور اس کے بھی حقوق ہیں' کچھ معاملات ایسے ہیں جو سادہ حل پیش نہیں کرتے اور بہترین ممکنہ نتائج کے حصول کے لیے مفادات کے محتاط توازن کے متقاضی ہوتے ہیں۔ایسی متنازعہ صورتحال میں افراد کے مخصوص حقوق کی معاشرے کی مجموعی ضروریات کے تناظر میں ناپ تول ہونی چاہیے اور مساوات کے دیگر پہلوؤں کا خیال رکھنا چاہیے' البتہ کسی بھی صورتحال میں بنیادی چیز ان اصولوں کا خیال رکھنا ہونی چاہیے جو اچھے معاشرے کی پہچان ہوتے ہیں' جیسا کہ پوپ جان پال دوم نے 1991ء میں کہا تھا ''معاشرتی اقدار کے بغیر جمہوریت کو آسانی سے مطلق العنانیت کی شکل میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔(2)

اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی معاشرہ خود کو شفاف اور منصفانہ قرار دینے کے دعوے کو اقلیتوں سے سلوک کے پیمانے سے ماپا جا سکتا ہے۔ میرا یہ بالکل واضح مؤقف ہے کہ اپنی تمام تر خامیوں کے

باوجود جمہوریت بہترین نظام حکومت ہے جس میں انسانی حقوق کا تحفظ اور صحت‘ تعلیم اور سماجی سہولیات کی فراہمی کو ممکن بنایا جاسکتا ہے۔ مجھے اب بھی یہ امید ہے کہ آنے والے وقت میں زیادہ سے زیادہ اسلامی معاشرے اس طرز حکومت کو اختیار کر لیں گے اور خواتین کو بھی حق رائے دہی میں شامل کیا جائے گا۔ یہ بھی ضروری ہے کہ مغربی ناقدین اور مسلمان ایک دوسرے پر تنقید کو متوازن بنائیں اور فرد کی آزادی و حقوق کے تحفظ کے بغیر صحت مندانہ معاشرے کی تشکیل کے لیے انفرادی ذمہ داریوں اور کارپوریٹ اخلاقی اصولوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے اور میں اپنے طور پر اس امکان کو رد نہیں کرتا کہ جمہوریت کا اسلامی تجربہ آنے والے دنوں میں مغربی اقدار پر اثر انداز ہوگا۔

ایک اور تکلیف دہ امر مغربی حکومتوں کا عرب اقوام سے غیر مناسب سلوک ہے‘ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے امریکہ کی طرف سے اسرائیل کی اندھا دھند حمایت سے دنیا بھر میں کروڑوں افراد میں غم و غصہ پھیلا ہے۔ میں اسرائیل کے وجود کا حامی ہوں اور اس کے امن‘ اس کی سرحدوں کی سلامتی کے حق کو تسلیم کرتا ہوں‘ عیسائیوں کے نزدیک یہودیت سے وراثت میں ملنے والا مذہبی ورثہ قابل احترام ہے‘ لہٰذا یہودیوں کے کندھوں سے کندھا ملا کر صیہونیت کے خلاف جذبات کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ اسرائیل نے 50 برسوں میں زمین کے استعمال کا غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہے اور ایک طاقتور ملک کے طور پر ابھر کر سامنے آیا‘ لیکن یہی 50 سال اسی خطے میں اسرائیل کے ہمسائے میں ایک اور عظیم قوم کے لیے زیادہ اچھے ثابت نہیں ہوئے‘ فلسطینی عوام محروم‘ دھتکارے اور کچلے ہوئے لوگ بن چکے ہیں۔ انہوں نے دیکھا ہے کہ کس طرح طاقتور مغربی اقوام فلسطین پر اقوام متحدہ کی کئی قراردادوں کو تساہل کے ساتھ لیتی رہی ہیں اور متعدد دیگر قراردادوں کو سرے سے نظرانداز کر دیا گیا۔ فلسطینی سمجھتے ہیں کہ بہرحال ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' والا مقولہ ٹھیک ہے۔ نصف صدی سے ناآسودہ امیدوں اور مسترد شدہ حقوق سے پیدا ہونے والا بے قابو غصہ ہمارے موجودہ بحران کا بنیادی نقطہ ہے۔ ہمیں اس بارے میں کوئی غلطی نہیں کرنی چاہیے۔ فلسطینی عوام کا استحصال موجودہ مسائل کا جذباتی مرکز بن چکا ہے اور ان زخموں کو مندمل کر کے زیادہ پرامن دنیا کے قیام کا مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے۔

اب مجھے ان مسائل کی طرف آنے دیجئے جو عدم مفاہمت کو مہمیز کرتے ہیں۔ مسلمان لیڈر خودکش بمباروں کی قاتلانہ سرگرمیاں روکنے کے لیے کافی اقدامات نہیں کر رہے، دیگر ایسے دہشت گردوں کے خلاف بھی مؤثر حکمت عملی اختیار نہیں کی جا رہی جو معصوم افراد اور فوج کے درمیان فرق نہیں رکھتے۔ جنوری 2002ء میں مسلمان، یہودی اور عیسائی عقیدے کے رہنماؤں نے اعلان سکندریہ پر دستخط کیے، مجھے شیخ جامعہ الازہر کے ساتھ اجلاس کی صدارت کا اعزاز حاصل ہے، اس میں کہا گیا کہ ''خدا کے نام پر معصوم افراد کی جان لینا اس بزرگ و برتر ہستی کے مقدس نام کی توہین اور مذہب کی بدنامی کا باعث ہے'' میں نے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیے بغیر مسلمان رہنماؤں سے کہا کہ وہ ان اقدامات کی مذمت کریں، برطانوی مسلمانوں نے ہمیشہ غیر مشروط طور پر دہشت گردی کی مذمت کی اور میں ان کے بے روک ٹوک اعلامیے پر بہت خوش ہوں۔ مشرق وسطیٰ کے مذہبی رہنماؤں کے بیانات اسرائیل کے ساتھ نفرت کے اظہار کے سوا اکثر مبہم اور غیر واضح ہوتے ہیں۔ مجھے اس نکتے پر زیادہ زور دینے کی اجازت دیجئے۔ مذہبی اساتذہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ دہشت گردی کے خوفناک نظریے کی جڑوں پر فقہی لحاظ سے حملے کریں، اگر مسلمان رہنما یہ کہیں گے کہ خودکش حملے کرنے والے شہید ہیں تو اس سے نہ صرف عسکریت پسندی کو چھوٹ ملے گی بلکہ پوری دنیا میں اسلام کی بدنامی بھی ہوگی۔

ایک اور قسم کا تکلیف دہ امر مسلمان ممالک میں غیر مسلموں کا احساس کمتری ہے۔ مجھے مسلمان ملکوں میں رہنے والے کئی عیسائیوں کے خطوط موصول ہوئے ہیں جن میں انہوں نے مذہبی آزادی کے فقدان اور زیادتی کی شکایات کی ہیں۔ میں یہاں ایک ایسے عیسائی کے خط کا ذکر کر رہا ہوں۔ جس کا نام خوف کی وجہ سے ظاہر نہیں کیا جا رہا ہے۔ ''مجھے اس تلخ تجربے کا خود سامنا کرنا پڑا ہے جو اسلام سے تبدیلی مذہب کر کے عیسائی بننے پر میرے سامنے آیا، ایسا کرنے والوں پر عرصہ حیات اتنا تنگ کر دیا جاتا ہے کہ انہیں یا تو تبدیلی مذہب کو خفیہ رکھنا پڑتا ہے یا ملک بدر ہونا پڑتا ہے۔ اگر مذہب بدلنے والے وہیں رہیں تو انہیں عمر بھر قانونی کارروائی یا خوف سے گزرنا پڑتا ہے۔'' یہ خط کوئی عجب نہیں، مسلمانوں اور مغرب میں جن انسانی حقوق کے دعوے کیے جاتے ہیں ان کا اطلاق مسلمان ممالک میں رہنے والی اقلیتوں پر بھی ہونا چاہیے۔ حال ہی میں جب سعودی عرب میں غیر مسلموں کو

کھلے عام مذہبی عقائد کی آزادی حاصل نہ ہونے کا سوال کیا گیا تو ایک ممتاز سعودی نے جوابدیا کہ ''یہ لوگ اپنے گھروں میں عبادات کریں'' کیا مسلمانوں کو یہ نظرنہیں آتا کہ یہ آزادی ناکافی ہے' عیسائیت' یہودیت' ہندوازم اور دیگر مذاہب صرف ذاتی مذاہب نہیں' بلکہ ان کو اظہار کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ اسلام کو ہے اور اس حقیقت کو مسترد کرنے والی کوئی بھی بات انسانی حقوق کے لئے دھوکا ہوگا۔ سعودی عرب میں بند دروازوں کے پیچھے بھی عبادت کرنے والے عیسائیوں کو قانونی طور پر سزاوار سمجھا جاسکتا ہے اور حقیقت میں ایسا ہوتا بھی ہے۔ سعودی عرب کو نظرثانی کرتے ہوئے دیگر عقائد کو بھی پنپنے اور غیر مسلموں کو عبادت کرنے کا حق دینا چاہیے۔

تو اس طرح یہاں میں نے فریقین کے مسائل پر بحث کی ہے اور یہ مسائل برملا مکالمے کے عمل کو وسیع تر رنگ میں رنگنے کے بنیادی اجزا ہیں ہمیں کیسے اور کس طریقے پر ان پر عمل پیرا ہونا چاہیے؟

اول' میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنے عقائد اور کلچروں کی گہرائی پر نگاہ دوڑانی چاہیے جو احترام اور مفاہمت پر مبنی ہے' میں نے حال ہی میں پاک ڈیوپو کی کتاب (3) ''عیسائیت اور مذاہب'' پڑھی ہے' اس میں مصنف نے عیسائیوں کو بائبل مقدس میں دیئے گئے بھائی چارے کے سبق کی دریافت کا چیلنج دیا ہے' وہ لکھتے ہیں کہ کس طرح عبرانی عہدناموں بشمول عہد نامہ نو میں خدا دیگر عقائد کے لوگوں سے محبت و یگانگت کا درس دیتا ہے۔ کتاب میں عیسائیوں اور چرچوں کے روایتی مؤقف سے ہٹ کر تصورات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ کیتھولک عقیدے پر سختی سے کاربند ہوتے ہوئے مصنف بتاتا ہے کہ کس طرح دیگر مذاہب کی سچائی کا ادراک کرتے ہوئے اپنے نظریے پر بنیاد پرست ہوا جاسکتا ہے۔ میری تجویز ہے کہ ہمیں دیگر عقائد کے پیروکاروں کو مکالمے سے شامل کرنے کے لیے اپنی تعلیمات کے تحت دیگر مذاہب کی حمایت حاصل کرنی چاہیے۔ ہمیں سمجھنا ہوگا کہ اپنے عقیدے کے اندر ہی ہمیں سچائی مل سکتی ہے اور دیگر عقائد کو الگ کرنے کی بجائے انہیں اپنے ساتھ منسلک کرنے کی روایت پیدا کی جائے۔ یہ سوال ہونا چاہیے کہ ''کیا میرا عقیدہ دیگر مذاہب کے بارے میں کوئی مثبت بات کہتا ہے؟ اپنی ذات کی حد تک میں ولفریڈ کینٹ ویل سمتھ کے اس نظریے کا قائل ہوں کہ ''عیسائیوں کے نزدیک خدا کی ذات کی تشریح یسوع مسیحؑ نے کی لیکن اسے حضرت عیسیٰؑ سے منتھی نہیں کیا جاسکتا۔'' عیسائی کی اصطلاح استعمال کرکے کیا میرے عقیدے سے باہر ''احترام'' کا وجود مل سکتا ہے؟ اپنے عقیدے پر سمجھوتہ کیے بغیر مسلمانوں' یہودیوں' ہندوؤں' سکھوں اور دیگر

مذاہب کے پیروکاروں کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ مختلف عقائد کی حقیقت کو تسلیم کریں۔ مثال کے طور پر قرآن کریم کی پانچویں سورت میں لکھا ہے۔ ''تمہارے نزدیک سب سے زیادہ محبت کا مستحق وہ ہونا چاہیے جو یہ کہے کہ ''میں عیسائی ہوں'' کیونکہ ان کے درمیان صاحب علم موجود ہیں اور وہ جاہل نہیں۔'' اس طرح سے اس شائستگی کی روح سامنے آتی ہے جو مکالمے اور مفاہمت کے قریب لانے کا باعث بنتی ہے۔

میں اس نقطے پر واپس جاتا ہوں جو میں نے آغاز میں بیان کیا تھا کہ: ہم خطرات والے دور میں رہ رہے ہیں اور ہم میں سے ہر ایک کو وہ حالات پیدا کرنے کے لیے اپنا کردار ادا کرنا ہوگا جو امن کی طرف سے جاتے ہیں۔ کینیڈا کی ایک ضرب المثل ہے کہ ''برف کا کوئی گلیشئر (ٹکڑا) یہ نہیں سمجھتا کہ برفانی تودہ اس کی وجہ سے حرکت میں آیا۔'' میرا مطلب یہ ہے کہ ہر فرد کا کردار اہم ہے' ہم سب مل کر تبدیلی لا سکتے ہیں۔ ہم جہاں کہیں بھی ہیں ہمیں باتوں سے آگے بڑھ کر عملی اقدامات کرنے چاہئیں اور ان لوگوں کو ساتھ ملانا چاہیے جو رواداری کے قائل نہیں' وہ لوگ جو مذہب کو بدی کے لیے استعمال کرتے ہیں اور وہ لوگ جو اسلام یا کسی بھی مذہب کی نیک نامی کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

خدا ہمیں میتھیو آرنلڈ کے ان مایوس کن اشعار سے دور رہنے کی توفیق دے جس میں انہوں نے کہا: ''دونوں عالم کے درمیان' ایک مردہ اور دوسرا اختیار پیدا ہونے والا ہے۔''

ہم بے اختیار نہیں' ہم مل کر ایک ایسی دنیا کو جنم دے سکتے ہیں جس پر ہم سب فخر کر سکیں اور جہاں روزویلٹ کی بتائی چاروں آزادیاں میسر ہوں............مذہبی آزادی' اظہار کی آزادی' قحط سے آزادی اور خوف سے آزادی۔

نوٹس

1- رونلڈ ڈورکن کی کتاب ''Taking Rights Seriously'' کیمبرج یونیورسٹی پریس' 1978۔

2- Centesimus Annus, P46

3- یاک ڈیوپو کی کتاب 'Christianity and the Religious' لندن 2001

باب16

انسان کی تمام مشکلات

ایڈورڈ او ولسن

جین برولر نے 1953ء میں اپنی نظم ''تم جان جاؤ گے'' میں انسانیت کی بنیادی الجھن کو مختصر انداز میں اس طرح بیان کیا تھا: انسان کی تمام مشکلات اس وجہ سے پیدا ہوتی ہیں کہ ہم نہیں جانتے کہ ہم کیا ہیں اور اس بات سے اتفاق نہیں کرتے کہ ہم کیا بننا چاہتے ہیں۔ یہ مشکل صورتحال ایک اور طرح سے بھی بیان کی جاسکتی ہے جو اس کا ممکنہ حل بھی ہوسکتا ہے' ایک انسان کی تمام مشکلات ان حقائق سے ابھرتی ہیں کہ ہمارے جذبات ابتدائی اور جیسے ہوتے ہیں' ہمارا ذہنی رجحان قرون وسطیٰ کی سطح پر ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں ہمارا ٹیکنو سائنسی کلچر عدم استحکام کا شکار ہو رہا ہے' جدید تہذیب ویسی ہے جیسا کہ فلم ''سٹار ٹریک'' اور ''سٹار وار'' میں دکھائی گئی ہے' جس میں ذہین جنگجو سردار خدائی ہتھیاروں کے ساتھ نہ ختم ہونے والی لڑائی لڑتے ہیں۔

موجودہ دور میں پائے جانے والے کم و بیش بے رحم حالات میں ہم عالمگیر کلچر کو تین مختلف سمتوں میں تقسیم پاتے ہیں۔ ان ابراہیمی مذاہب کے نظریات کے مطابق انسانیت خدا کی تخلیق ہے' جو مقدس صحیفوں اور دانا پیغمبروں کے توسط سے ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ دوسرا عالمی تصور سیاسی رویہ پسندی Political Behaviourism سے متعلق ہے' جو زیادہ تر ختم ہوتی کمیونسٹ ریاستوں میں نظر آتا ہے۔ اس فلسفے کے مطابق ذہن ایک خالی تختی کی مانند ہوتا ہے جس کے نتیجے میں تاریخی تناظر میں ارتقاء پذیر ہونے والے کلچر کی دماغ میں عکاسی ہوتی ہے' چونکہ انسانی فطرت کا کوئی وجود نہیں ہوتا لہٰذا لوگوں کو مثالی سیاسی اور معاشی نظام کے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے...... مذاقاً یہ کہ بیسویں صدی کے بیشتر حصے میں دنیا پر کیمونزم اختیار کرنے کے لیے زور دیا گیا' اس

عقیدے کو انسان کی بھٹی سے گزارا گیا لیکن بار بار معاشی بحرانوں اور لاکھوں افراد کی ہلاکت کے بعد ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

یہ دونوں عالمی نقطۂ ہائے نظر یعنی خدا کے تصور پر مبنی مذہب اور بے عقیدہ کمیونزم کو ایک تیسرے قطعی مختلف نقطۂ نظر کے اختلاف کا سامنا کرنا پڑا اور یہ تھی سائنسی انسان پرستی' اگرچہ اس عقیدے کے حامل افراد کی تعداد اب بھی دنیا میں بہت کم ہے اور ان کا یقین ہے کہ انسان ایک حیاتیاتی مخلوق ہے جو کروڑوں برسوں سے اس حیاتیاتی دنیا میں ارتقاء پذیر ہوئی' اور ذہانت کی حامل اس مخلوق پر پیچیدہ موروثی جذبات کا غلبہ ہوتا ہے' ان جذبات کی اجتماعی شکل یعنی انسانی فطرت دراصل ارتقاء کی باریک وراثت ہے' ہماری یہ کیفیت اب ابتدائی زندگیPaleo lithic life سے جب انسانیت کی 99فیصد تکمیل ہو چکی تھی' اس وقت انسان کے رویے کی حالت وہی ہے جو ڈارون نے اپنی کتاب ''انسان کے اجداد'' میں سطحیOrigin کے طور پر بیان کی ہے۔ حیاتیاتی فطرت کو بہتر طریقے سے سمجھنے اور ہمارے ارتقاء پذیر کلچر کی تاریخ اور روابط جاننے سے ہم مذہبی جکڑ بندیوں کے بخار اور خالی تختی کے فلسفے کی حقیقت سے آگاہ ہو سکتے ہیں' لیکن خود شناسی اور دانشورانہ آزادی کے لیے درکار چوائس کا بوجھ موجود ہو سکتا ہے۔

مذہب تقسیم کرتا ہے' سائنس متحد کرتی ہے' بالعموم مذہبی فلسفہ عالمی تنازعے کا عکاس ہوتا ہے جبکہ سائنس پر مبنی انسانیت پسندی اس گمراہ کن اثر کو زائل کرنے کا مؤثر ذریعہ ہے۔

انسانی فطرت کی ایسی منقسم طاقت کیسے معرض وجود میں آتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انسانیت کی گہرائی کے لیے جنسیاتی تاریخ اور مذہبی عقیدے نے آسانیاں پیدا کیں۔ اس نے زندگی و موت کی کشمکش کے دوران ہر قبیلے کے فرد کو متحد رکھا اور اپنے پیروکاروں کو احساس برتری میں مبتلا رکھا' قبائلی ضابطوں کو مقدس قرار دیا۔ مذہبی رسوم کے ذریعے تقدیس رائج کی گئی اور اس نے متصادم طبقوں کو راحت دی' اس طرح لوگوں کو شناخت اور مقصدیت دی گئی جبکہ کئی لحاظ سے شخصی لافانیت کی راہ ہموار کی۔

کئی ماہرین حیاتیات سمجھتے ہیں کہ دیومالا کی فراہم کردہ مسابقانہ ترجیح اور مذہبی جذبہ نے ارتقاء کے دوران جین Gene کے پھیلاؤ میں مدد دی' جس سے اس نفسیاتی عمل کے اجراء کے لیے

ضابطے کی تشخیص ممکن ہوسکی۔ دماغ کو سخت قسم کی مذہبیت اختیار کرنے کے لیے پروگرام کیا گیا۔ یہ چاہے منظّم مذہب کا نظریہ تھا یا اس کے برعکس سیکولر نظریہ تھا۔

انسانی تاریخ پر مذہب کا مثبت اثر بہت گہرا رہا ہے۔ اس نے بہترین تہذیب' سچائی کے نمونے اور عوامی خدمت کی اچھائیوں کو جنم دیا۔ تاریخ میں اس نے فنون کی بنیاد رکھی' دیومالاؤں کی تخلیق بھی بذات خود علم کا آغاز تھا۔ یہ ابتدائی دور میں کائنات اور انسانی بقا کی تشریح کا بہترین ذریعہ تھا۔

تاہم اس کے باوجود مذاہب کی قبائلی ساخت نے انہیں ہمیشہ برقرار رہنے والی خطرناک تقسیم سے دوچار کیا۔ یہ ایک بنیادی اور غیر ضروری خلا تھا جو آج بھی برقرار ہے۔ سچے پیروکار سمجھتے ہیں کہ ہمارے خدا تمہارے جھوٹے بتوں کے خلاف ہیں' ہماری پرہیزکاری تمہاری کرپشن کے سامنے کھڑی ہے' ہمارا سچا علم تمہارے نقص کے مقابل ڈٹا ہے۔ نفرت یا غیر انسانی تصورات کی حامل یہ خدا کا روایتی مذہب کی تشریح کرنے والی دیومالاؤں کے باوجود قائم دائم ہے' مثلاً لافانیت کے عقیدے کے حامل افراد کے نزدیک یہ خیال زیادہ وقعت نہیں رکھتا' انہیں جنت کا یقین تو ہے لیکن یہ معلوم نہیں کہ لازوال جنت کا مطلب کیا ہے' کائنات کے اولین ایک ٹریلین برسوں' جسے ہم تقریباً آغاز کہہ سکتے ہیں۔ میں اس کائنات کا وجود عمل میں آیا جس میں ہم رہ رہے ہیں اور یہ اس وقت تک رہے گی جب تک خدا اس کے خاتمے کے لیے حق و باطل کا معرکہ قیامت برپا نہیں کرتا اور یہ فطری طور پر مر جائے گی' اس کے بعد کروڑوں ایسی کائناتیں اس کی جگہ لینے کے لیے وجود میں آسکتی ہیں اور منطقی انجام کا شکار ہوسکتی ہیں۔

حیات بعد از ممات کے نظریے کے حامل افراد یہ نہیں دیکھتے کہ روح کو دماغ سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور یہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا' ذہن کی جذباتی یا خوشگوار کیفیت کیا ہے کسی بھی واقعے میں انسانی ذہن حتیٰ کہ ابتدائی ٹریلین برسوں میں کیسا تھا؟ اسے یقیناً نفساتی دورانیے میں چلنا چاہیے' مالیکیولی واقعات میں ذہن واقعی برقرار رہتا ہے تو مائیکروسیکنڈ سے گھنٹوں تک کیا کچھ وقوع پذیر ہوسکتا ہے' دماغ اصل میں بیانی مشین ہے' واقعات کے وقوع پذیر ہونے کا پروسیسر' اس کے نتیجے میں انسان دیگر جانداروں کی طرح ناقابل گرفت نمو اور تبدیلی والی مخلوق ہیں' ان کی زندگیاں زمین کے چکر Cycle سے عبارت ہیں' جن کا اختتام بھی ہے اور آغاز بھی' اسے تبدیل کرلیں آپ فرد کے ہر ہر مطلب اور مقصد سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

مذہبی جنگوں Crusades اور جہاد کو فروغ دینے والے عسکریت پسند اہل عقیدہ کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں' وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے مقصد کی سچائی صرف انسانوں کے ذہن میں پائی جاتی ہے۔ دیوتا ان کے جذبات کا شاخسانہ ہیں اور آخر میں یہ لوگ اور ان کے خدا صرف اسلحے کی طاقت اور بے انتہا دولت کی بناء پر فتح حاصل کرتے ہیں' لہٰذا سچے پیروکاروں کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ تخلیق سے متعلق دیو مالاؤں جو مذہبی بنیاد کی تشریح کرتی ہیں اور تصادم کا باعث بنتی ہیں اس انسانیت سے مماثل نہیں ہوتیں جو حقیقی دنیا کی تخلیق سے وجود میں آتی ہیں' ابراہیمی مذاہب کے معاملے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں پیروکار انبیاء کی تعلیمات کی روح تک نہیں پہنچتے' بعد از موت زندگی کے بارے میں زیادہ تفصیلات نہیں بتائی جاتیں یا بتانا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ قرآن اور دیگر الوہی کتب دنیوی نظریات اور مشرق وسطیٰ میں اس دور کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ سائنس دراصل آگاہی کا دوسرا نام ہے اور یہ بالخصوص خاص قسم کی معلومات کا منبع ہوتا ہے' لیکن سائنس صرف عقیدے کا نظام نہیں اور نہ صرف مخصوص معلومات کا ماخذ ہے بلکہ یہ ان ذہنی سرگرمیوں کا مجموعہ ہے جو تعلیم یافتہ افراد کی عادات سے جنم لیتی ہیں' اس طرح مادی دنیا میں زندگی گزارنے سے متعلق تفصیلات بتاتی ہیں' سائنسی علم جو سائنس کے طریقے سے سامنے آتا ہے دراصل کائنات سے متعلق وہ یقین ہے جو انسانیت جانتی ہے اور اس میں انسانی دماغ اور ذہن بھی شامل ہے۔ چونکہ ساخت کے لحاظ سے یہ آلاتی اور معروضی ہے اسی طرح شفاف اور منعکس ہے لہٰذا اس سے ثقافتی اختلافات جنم لیتے ہیں۔

جہاں تک ضرورت کا تعلق ہے تو سائنس اس حوالے سے ہمیشہ حساس رہی ہے' اس کا حقیقی منشور یہ اہم اصول کہ ''یہ بہترین ممکنہ چیز ہے اگر چہ یہ غلط بھی ہوسکتی ہے۔'' ہوسکتا ہے اور یہ کہتی ہے کہ ٹھوس شواہد ہی رہنمائی کا کام کرتے ہیں' فرقہ وارانہ مذہبی عقیدے کا سچا منشور اس کے بالکل الٹ ہے' وہ کہتا ہے کہ ''یہ بہترین ممکن چیز ہے کیونکہ یہ خدا کی طرف سے ہے' اور اسے صحیح ہی ہونا چاہیے چاہے شواہد اسے ثابت کریں یا نہ کریں' فطری سماجی علوم پر مشتمل سائنس پچھلی دو صدیوں سے متعدی لحاظ سے پھیل رہی ہے اور گزشتہ تاریخ کے بارے میں تحقیق کا کام کیا جاتا رہا۔

سائنسی علم ہر دو عشروں کے بعد تقریباً دوگنا ہوجاتا ہے' دریافت اور اطلاق کی اس کی خوبی

انسانیت کو قریب لاتی ہے' سیکولر معیشت میں یہ نازی ازم اور مارکسزم۔ لینن ازم جیسے جھوٹے سیکولر نظریات کو خاموش کر سکتی ہے لیکن یہ اتنی آسانی سے مذہبی مباحث کا جواب نہیں دیتی جو انسانی ذہن کو جینیاتی طور پر اطمینان باہم پہنچاتی ہے۔ مذہبی عقیدے کی سمت میں پہلا قدم اطاعت ہوتا ہے جبکہ سائنسی سمت میں اولین قدیم سیکھنا یا جاننا ہوتا ہے۔ مذہبی معاملہ بڑی آسانی سے کسی بچے کو سمجھایا جاسکتا ہے لیکن علم کا عقلی استدلال بڑی مشکل کے بعد سمجھا جاتا ہے۔

جینیاتی حوالے سے ہم ایک چیز پر یقین رکھتے ہیں اور انٹلیکچوئل طور پر بعض اوقات قطعی مختلف صورتحال دریافت ہوتی ہے۔ یہی دراصل انسانی صورتحال کی الجھن ہے' اس کا فوری حل کوئی نہیں۔ یہ جاننا مشکل ہے کہ کس طرح مختلف مذاہب نے قبائلیت اور دیومالاؤں میں جڑ پکڑی' انسانیت' دنیا کی حقیقی نوعیت میں' بلاشبہ حل بیان کرتی ہے۔ حقیقی دنیا کے زیادہ تر ادوار میں لوگوں کی اکثریت اسی بات کی خواہاں رہی۔ اس میں امن' احترام' جسمانی صحت' ایک خاندان اور اچھا معیار زندگی' چوائس کی آزادی' دلچسپ اور خوشگوار ماحول اور حالات بہتر بنانے کے مواقع شامل ہیں۔ قسمت کے ساتھ یہ سب کچھ حاصل ہوجاتا ہے' کچھ موافق آثار بھی ہیں' دنیا کی شرح آبادی کم ہو رہی ہے اور اس صدی کے اختتام تک 10 ارب تک رہنے کی امید ہے۔ یہ بات سامنے آئی ہے کہ جب خواتین کو ذاتی خودمختاری دینے کے اقدامات کیے جاتے ہیں تو بچوں کے انبار لگانے کی بجائے کم تعداد میں معیاری بچے پیدا کرتی ہیں۔ صرف معیشت نہیں علم کی گلوبلائزیشن بھی بڑھ رہی ہے۔ خیالی دیومالاؤں کو زیادہ اہمیت نہیں دی جا رہی اور اعتدال پسندوں کو استحکام مل رہا ہے۔ فطرت پسندی پر مبنی عالمی نظریے کو فروغ مل رہا ہے اور یہ اخلاقی استدلال کو سیکولر رنگ میں دکھائے گا' المناک تصادم پر یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ مذہبی نظریات زیادہ مؤثر رہنا نہیں' قبائلی تفاخر کے لیے اور بہت سی چیزیں ہیں اور آنے والے وقت میں انسانیت بہتری کی طرف گامزن ہوگی۔

باب 17

دشمنوں کو دوست بنانا

چیف ربائی جوناتھن ساکس

20 صدیوں پہلے کی بات ہے، صیہونیت نے ایک سوال اٹھایا: ہیرو کون ہے؟ حالیہ ادوار تک زیادہ تر ادب میں ہیرو اس انسان کو قرار دیا گیا جو میدان جنگ میں بہادری کے جوہر دکھاتا ہے۔ لڑتا ہے، مارتا ہے، حتیٰ کہ نوبل کاز کے لیے اپنی جان بھی دے سکتا ہے۔ ہیرو وہ ہے جو اپنے دشمنوں کو شکست دیتا ہے، لیکن یہودی ربائی اور مختلف انداز میں سوچتے تھے، ہیرو کون ہوتا ہے؟ وہ جو دشمن کو دوست بنا لیتا ہے۔

مجھے یہ جواب دانشمندانہ لگتا ہے، اگر میں آپ کو شکست دیتا ہوں تو میں فاتح ہوں گا اور آپ مفتوح، لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں بھی ہار گیا، آپ کو زک پہنچا کر میں نے خود کو بھی رسوا کر لیا، لیکن سچائی کے اس لمحے میں اگر میں آپ کو معاف کر دوں اور آپ مجھے معاف کر دیں تو یہ عمل مصالحت کی طرف بڑھ جائے گا اور مصالحت دوستی کا پیش خیمہ ہوتی ہے، اور ایک دوسرے سے لڑنے کی بجائے دوستی میں ہم مشترکہ مسائل سے مل کر لڑ سکتے ہیں۔ غربت، افلاس، قحط، بیماری، تشدد، ناانصافی اور ایسے تمام دیگر زخم جو اب بھی دنیا کے چہرے پر بدنما داغ ہیں۔ آپ کی کامیابی، میری کامیابی ہے اور ان تمام افراد کی بھی جو ہم سے وابستہ ہیں، یہ کامیابی معاشی، سیاسی اور سب سے بڑھ کر روحانی ہوتی ہے۔ میری اپنی دنیا اب مزید بڑی ہوگئی ہے کیونکہ اس میں اب (بحیثیت دوست) آپ بھی شامل ہو چکے ہیں، ہیرو (بہادر) کون ہے؟ وہ جو دشمن کو دوست بنا لیتا ہے۔

اگر یہ نظریہ تقویت حاصل کرلے تو آج کی دنیا کتنی مختلف نظر آئے۔ 1999ء کے موسم گرما میں جنگ سے تباہ حال کوسوو کے شہر پرسٹینا کی سڑکوں پر کھڑا تھا، نیٹو کا جنگی آپریشن تھوڑے دنوں پہلے ہی

ختم ہوا تھا' کوسوو کے البانوی نژاد باشندے گھروں کو واپس آ چکے تھے لیکن فضا میں تلخی اور غصے کا ماحول برقرار تھا' گزشتہ کئی ماہ سے البانوی لوگ سربوں کی دہشت میں مبتلا رہے اور اب سربوں کو البانوی باشندوں سے جان کے لالے پڑے تھے' وہاں امن تھا لیکن یہ امن حقیقت نہیں تھا' جنگ ختم ہو چکی تھی' لیکن مصالحت کا عمل شروع نہیں ہوا تھا' میں جن فوجیوں سے ملا ان میں سے اکثر مستقبل کے خوف میں مبتلا تھے' وہ سمجھتے تھے کہ ایک دن.....کل نہیں' اگلے سال نہیں بلکہ کسی دور میں.....تصادم پھر شروع ہو جائے گا' جیسا کہ خط بلقان میں ماضی میں کئی بار ایسا ہو چکا ہے۔

تباہ شدہ عمارتوں اور بدحالی زندگی کے درمیان کھڑے ہو کر میری سمجھ میں آیا کہ ''معافی'' کے ایک لفظ سے دنیا کو کتنا تبدیل کیا جا سکتا ہے' اگر دوسروں کو معاف کر سکتے ہیں اور یہ بھی توقع کرتے ہیں کہ دوسرا ہمیں معاف کر دے گا تو پھر ہم ماضی کا قیدی بنے بغیر ماضی کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ اس کے بغیر ہم خود کو اپنے بچوں کو ماضی کے تنازعات پر بار بار لڑائیاں کرنے کے لیے مطعون کریں گے' پرانی طرز کی تباہی' ویسا ہی خون خرابہ' ویسا ہی روح انسانی کا ضیاع اور خدا کی زمین کی ویسی ہی تباہی۔

اس چکر کو توڑنا ایک آسان کام ہے' جنگ کے لیے جسمانی Physical جرأت کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ مصالحت کا عمل اخلاقی جرأت کا متقاضی ہوتا ہے' اور یہی بہت کم ہوتا ہے۔ جنگ میں عام لوگ ہیرو بن جاتے ہیں' امن کی کوششوں کے دوران عظیم لیڈر بھی۔ کوئی رسک لینے سے ڈرتے ہیں' لیکن مصر کے سابق صدر انور سادات اور اسرائیلی وزیراعظم اسحاق رابن میں رسک لینے کی جرأت تھی اور دونوں کو اس کے لیے جان کی قربانی بھی دینی پڑی۔

یوں اگر اب انسانیت کو 21 ویں صدی میں برقرار رکھنا ہے تو اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں' بربادی کے لیے ہماری گنجائش کافی زیادہ بڑھ چکی ہے۔ نئی مواصلاتی ٹیکنالوجی کے ذریعے نفرت منتقل کرنے کی اہلیت بھی کئی گنا زیادہ ہو گئی ہے۔ وہ دور گیا جب مخاصمت مقامی نوعیت کی ہوتی تھی اور اس کی شدت بھی قابل برداشت اور رسائی محدود ہوتی تھی۔ گلوبلائزیشن سے سب سے پہلے جس چیز کو فائدہ پہنچا وہ ہے دہشت...... دنیا کے ایک حصے میں پیدا ہونے والا اشتعال دوسری جگہ پر تباہی کا شاخسانہ بن جاتا ہے۔ جنگ تو میدان جنگ میں لڑی جاتی ہے لیکن دہشت گردی کا کوئی محاذ جنگ

نہیں اور یہ عالمگیر حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اگرچہ اس کی طبعی شدت کو ماپا جاسکتا ہے لیکن دراصل یہ ذہن میں لڑی جاتی ہے۔ مختصراً یہ کہ تنازعات کو ہتھیاروں سے جیتا جاتا ہے' طویل المدت طور پر ان کا حل نظریات میں ہی پوشیدہ ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران شاعر ڈبلیو ایچ آڈن نے کہا تھا:

''ہمیں لازماً ایک دوسرے سے محبت کرنا پڑے گی یا مرنا ہوگا۔''

یہ ایک انوکھی قسم کی امید ہوسکتی ہے لیکن ہمیں کم سے کم دشمنوں کو دوست بنانے کی کوشش کرنا پڑے گی' ہمیں تہذیبوں کے مابین تصادم کو مکالمہ کی عمل میں تبدیل کرنا ہوگا' اس کے لیے دنیا کے بڑے مذاہب کو قیادت کرنا پڑے گی۔

کیا مذہب ہی تنازعے کا بنیادی ماخذ ہے؟

اکثر مذاہب امن کی قدر کرتے ہیں تو پھر آخر یہ اکثر تنازعات کا ذریعہ کیوں بنتے ہیں؟ لفظ ''مذہب'' لاطینی زبان سے مستعار لیا گیا ہے جس کا مطلب ہے ''جوڑنا''۔ مذاہب لوگوں کو ایک دوسرے سے اور خدا سے جوڑتے ہیں' یہ ''میں'' کی جگہ ''ہم'' تشکیل دیتے ہیں' بالفاظ دیگر مذاہب گروہی پہچان کی تخلیق کرتے ہیں' یہی آج کل مختصراً ان کی طاقت ہے۔ 20ویں صدی پر زیادہ تر نظریات کی سیاست کا غلبہ رہا' جبکہ 21ویں صدی پر شناخت کی سیاست جاری رہے گی اور بات جب شناخت کی ہو تو لوگ مذہب کی طرف رجوع کرتے ہیں' کیونکہ اس میں انسانیت کے بارے میں سوالوں کا مفصل جواب موجود ہے: میں کون ہوں؟ میں یہاں کیسے ہوں؟ میں کس بیانیہ کا حصہ ہوں؟ میں کس طرح زندہ رہوں گا؟

تاہم ''ہم'' کی تخلیق کا عمل ''ان کے'' سے منسلک ہے...... لوگ ''ہم جیسے نہیں'' ' غیر ہیں' واردشدہ ہیں' کافر ہیں' وہ جو دائرے سے باہر کھڑے ہیں' غیر اہم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں انہوں نے اپنی سرحدوں کے ''اندر'' کمیونٹی کی تشکیل پر توجہ دی' مذہب سرحدوں سے باہر بھی تنازعات پیدا کرسکتا ہے' اس طرح وہ زخم بوتے بھی ہیں اور گزند بھی پہنچاتے ہیں' جوڑتے ہیں اور تباہ بھی کرتے ہیں۔

عبرانی بائبل (تورات) انسان کی تاریخ کے باب میں آغاز میں واضح طور پر خبردار کرتی ہے'

حضرت آدم کے پہلے دو بیٹوں قابیل اور ہابیل نے خدا کی عبادت کی...... یہ انسان کی پہلی تصدیق شدہ عبادت تھی' جو اختلاف میں بدل گئی' اور دشمنی سے ہوتے ہوئے جھگڑے تک پہنچ گئی۔ اس کے اثرات بالکل واضح ہیں' مذہب ایک آگ کی طرح ہے' جو حدت پہنچاتی ہے اور جلاتی بھی ہے اور ہم اس شعلے کے نگہبان ہیں۔

تورات میں ہابیل' قابیل کے عبرانی زبان میں بیان کیے گئے واقعے میں ایک غیر معمولی آیت بھی ملتی ہے' اس کی بے ترتیبی کی وجہ سے اس کا ترجمہ ناممکن ہے تاہم اس کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہوسکتی ہے:

''قابیل نے اپنے بھائی ہابیل سے کہا' ''آؤ باہر کھیتوں میں چلیں' قابیل نے اپنے بھائی ہابیل پر حملہ کر کے اسے ہلاک کر دیا۔'' (Genesis 4:8)

البتہ یہ الفاظ ''آؤ باہر کھیتوں میں چلیں'' اصلی آیت میں نہیں' وہاں اس طرح سے کہا گیا ہے۔

''قابیل نے اپنے بھائی ہابیل سے کہا...... اور جب وہ دونوں کھیت میں تھے' قابیل نے اپنے بھائی ہابیل پر حملہ کیا اور اسے مار ڈالا۔''

''قابیل نے کہا:'' لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ اس نے کیا کہا ہوگا' یہ فقرہ ٹوٹا ہوا ہے' الفاظ ناکام ہوئے' گفتگو منقطع ہوئی' مکالمے میں خلل پڑ گیا' اب دونوں بھائی مزید بات نہیں کر سکتے تھے' اس طرح اس بے سقم طریقے سے تورات انتہائی بنیادی سچائی کو بیان کرتی ہے کہ ''جب الفاظ ناکام ہو جائیں تو تشدد شروع ہو جاتا ہے۔''

یہ وہ نکتہ ہے جو تورات نے بار بار بیان کیا ہے' یہ عمل حضرت یعقوبؑ کے پسندیدہ بیٹے حضرت یوسفؑ کے واقعے میں بھی نظر آتا ہے۔

''جب ان کے بھائیوں نے دیکھا کہ ان کے والد یوسفؑ سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں' تو انہیں بھائی سے نفرت ہوئی اور وہ یوسف سے دوستانہ انداز میں مخاطب نہ ہوتے۔''

(Genesis 37:4)

ان کی دشمنی بڑھتی چلی گئی' ایک مرحلے پر بھائیوں نے حضرت یوسفؑ کو قتل کرنے کا سوچا' آخر کار انہوں نے اسے غلام کے طور پر فروخت کر ڈالا۔

کئی صدیوں بعد حضرت داؤدؑ کے بیٹے ابسلوم کو پتہ چلا کہ اس کے سوتیلے بھائی آمنن نے اس کی بہن سے زیادتی کی ہے' اس وقت اس نے کچھ نہ کہا:

''ابسلوم نے آمنن سے ایک لفظ نہ کہا' اچھا یا بھلا' وہ آمنن سے نفرت کرتا تھا کیونکہ اس نے اس کی بہن کی عصمت دری کی تھی۔'' (2 Samuel 13:22)

یہ خاموشی معافی کی نہیں بلکہ سرد عزائم کی تھی۔ دو سال بعد ابسلوم نے انتقام لے لیا۔

حضرت یوسفؑ کے قصے میں تورات کے بیان سے ایک اور ایسی چیز ہے جس کا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا عبرانی بیان اس طرح سے ہے: ''وہ اس سے نفرت کرنے لگے اور اس کے ساتھ دوستانہ انداز میں مخاطب نہ ہوتے۔'' اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ حضرت یوسفؑ سے امن کی بات نہ کرسکے' جیسا کہ ہابیل و قابیل کے واقعے میں ان کی مخاصمت سے ایک زبردست پیغام ملتا ہے۔ تنازعے کے حل کے لیے کمیونیکیشن ایک بڑا ہتھیار ہے' اگر جارحیت کو مکالمے سے بے اثر نہیں کیا جاتا تو یہ ختم نہیں ہوگی بلکہ بڑھے گی' بات چیت امن کی طرف لے جاتی ہے' اور طاقتور جذبات کے تحت اسے ختم نہیں ہونے دیتی۔ اپنی تکلیف بیان کرنے سے مسئلہ حل ہوسکتا ہے' لیکن درد کے اظہار یا اسے نہ سننے سے یہ بالآخر پھٹ پڑتا ہے اور یوں زندگیاں داؤ پر لگ جاتی ہیں۔

مذاکرات بطور عبادت

بائبل تلمود (بیرک ہوت 26بی) میں ایک جملہ ملتا ہے (Ein bichah ela tefillah) جس کے لغوی معنی ہیں' ''بات چیت عبادت کی ایک شکل ہے۔'' یہ ایک بنیادی نظریہ ہے' مذاکرات میں اپنے خیالات دوسرے فریق تک پہنچاتا ہوں' بولنا یہ ہے کہ میں اپنی امیدوں اور خدشات کو آواز کا روپ دیتا ہوں' سننا یہ ہے کہ میں دوسروں کو سنتا ہوں اور دنیا کا ایک اور پہلو سے جائزہ لیتا ہوں۔ میں یہ سیکھتا ہوں کہ دوسرے الوہی عقیدے کا سامنا کیسے کیا جائے' خود پرستی سے بڑھ کر حقیقت' عبادت صرف بولنے نہیں بلکہ سننے کا بھی عمل ہے' مذاکرات عبادت کی ایک شکل ہیں۔ بولنے کے دوران لین دین ہماری انسانیت کی روح ہے' تورات Genesis 2:7 میں بیان ہے کہ: ''اور اللہ نے انسان کو زمین کی گرد سے پیدا کیا اور اس کے نتھنوں سے زندگی کی روح پھونکی' جس سے انسان ایک زندہ مخلوق بن گیا۔'' ایک اور قدیم عہد نامے میں یہ فقرہ اس طرح دیا گیا ہے

کہ ''اور انسان بولنے والی روح بن گیا۔'' گویا بولنا ہی ہمیں انسان بناتا ہے۔ انسانی جسم ڈی این اے پر مبنی کیمیائی ڈھانچے کا مکس ہے' جسے تورات نے ''زمین کی گرد'' قرار دیا ہے۔ یہ دراصل زبان کا استعمال ہے جو جسم کو خدائی روح سے ملاتی ہے۔ Homo Sapiens کی سب سے اچھی تعریف یہ ہے کہ ''زندگی کی وہ شکل جو کلام کرتی ہے۔''

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ابراہیمی مذاہب ...... یہودیت' عیسائیت اور اسلام تین ایسے عظیم مذاہب ہیں جو وحی سے نازل کیے گئے' یہ ان مذاہب کی امتیازی حیثیت بیان کرنے کا غلط طریقہ ہے۔ تمام قدیم مذاہب بھی وحی پر ایمان رکھتے تھے' ان کا عقیدہ تھا کہ دیوتاؤں کو خدائی مظاہر یعنی ہوا' بارش' سورج' سمندر اور آندھی میں دیکھا جاسکتا ہے۔ تینوں ابراہیمی مذاہب کی انفرادیت یہ نہیں کہ خدا نے خود کو ظاہر کیا بلکہ اس نے الفاظ کے ذریعے اپنی پہچان کرائی۔ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ زبان مقدس ہے۔

فطرت کی توفیق طاقت کی علامت نہیں اور الفاظ معانی کی علامت ہیں۔ فطرت انسانوں کے لیے غیر مختلف ہے' زبان انسان کی منفرد ملکیت ہے' یہودیت' عیسائیت اور اسلام میں جو چیز مختلف ہے وہ ان عقائد میں خدا کے تصور کا اظہار ہے اور خدا بولتا ہے۔ زبان واحد چیز ہے جو شعور کے مرکز کے مابعد طبیعاتی پہلوؤں پر مشتمل ہوتی ہے' یہ ہمیں یقین دلاتی ہے کہ ہم اس گونجتی کائنات میں تنہا نہیں ہیں۔

اس لیے اگر یہودی' عیسائی اور مسلمان خدا سے اپنے تعلق میں سچے ہیں تو انہیں ظاہر کرنا ہوگا کہ تقریر طاقت سے بڑی چیز ہے' مذاکرات کا عمل طاقت کے استعمال سے کہیں بہتر ہے' خدا نے ہمیں سبق دیا ہے کہ ہم اس کی ذات کو استدلال کے طور پر نہیں' وہ ہمیں علم دیتا ہے تاکہ ہم اسے آگے پھیلائیں' جو انسان دوسرے انسان کو تسلیم نہیں کرتا وہ خدا کی ذات کی نفی کرتا ہے۔

تنازعے اور تشدد سے مصالحت اور امن کی طرف

سولہویں صدی کے آغاز میں یورپ سیکولرازم سے روشناس ہوا' جس کے تحت پہلے سائنس' پھر عمومی علم' پھر سیاست' طاقت اور آخر میں کلچر آتا ہے۔ اس طرح انہوں نے مذہب سے چھٹکارا حاصل کرلیا' یوں سیکولر یونیورسٹی وجود میں آئی' پھر سیکولر قوم یا ملک اور سیکولر معاشرہ۔

روایتی دانش یہ ہے کہ ایسا اس لیے ہوا کیونکہ لوگوں نے خدا پر یقین چھوڑ دیا تھا' حالانکہ ایسا

نہیں تھا' ایسا اس لیے ہوا کیونکہ اہل عقل اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ خدا کے بندے ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ یہ دراصل خدا کی ناکامی نہیں بلکہ دراصل ان کی ناکامی تھی جو زمین پر خود کو خدا کا نمائندہ قرار دیتے تھے۔

21ویں صدی میں دنیا میں بین الاقوامی بدامنی کی طرز کا دور سولہویں اور سترہویں دور میں بھی تھا' جب یورپ میں مذاہب پر عظیم جنگیں لڑی گئیں' اس وقت ہمارے سامنے دو قسم کی چوائس ہیں' اول یہ کہ کیا مذہب بدستور تنازعے کا ماخذ برقرار رہے جس کے لیے لمبی لمبی جنگیں لڑی جائیں' دنیا کو ایک بار سیکولرائز کر دیا جائے یا چیلنج سے نمٹنے کے لیے مذہب کو سامنے لایا جائے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ابراہیمی مذاہب میں خدا کی وحدانیت کا راسخ تصور موجود ہے۔ خدا کی مرضی یہ نہیں کہ فتح کے ذریعے کسی کا عقیدہ تبدیل کیا جائے' یہ سامراجیت کی زبان ہے' مذہبی عقیدہ نہیں۔ ہمیں دیگر انسانوں کو اس طرح سننا چاہیے گویا قدرت اس کے ذریعے ہم سے مخاطب ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ یہ ناگزیر ہے۔

میں ایک یہودی ہوں' اور ایک یہودی کی حیثیت سے مجھے اپنے آباؤ اجداد کے مصائب اور آنسو ورثے میں ملے ہیں۔ میرے ہم مذہب افراد کی داستان جلاوطنیوں' ترک وطن' قید و بند سے عبارت ہے' پہلی صلیبی جنگ میں یورپ میں دو تہائی یہودیوں کو تہہ تیغ کر دیا گیا۔ صدیوں تک یہودی اس خوف میں مبتلا رہے کہ انہیں یا ان کے بچوں کو محض اس لیے مار ڈالا جائے گا کیونکہ وہ یہودی ہیں' میں اپنی روح پر منقش اس دکھ کو کیسے بھول سکتا ہوں؟

لیکن اس کے باوجود اپنے بچوں کے لیے مجھے بھولنا ہی ہوگا۔ کیا جرمنوں سے نفرت کر کے میں ہولوکاسٹ میں مرنے والے ایک یہودی کو بھی واپس لا سکتا ہوں؟ کیا خدا سے محبت کا یہ تقاضا ہے کہ میں دیگر انسانوں سے کم محبت کروں؟ اگر میں خدا سے التجا کرتا ہوں کہ وہ مجھے معاف کر دے تو کیا وہ مجھے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں بھی اس کے بندوں کو معاف کر دوں؟ میرا یہ فرض ہے کہ میں ایک ایسی دنیا کی تشکیل میں تعاون کروں جہاں میرے آباؤ اجداد کی طرح لوگوں کو مذہب کے نام پر نہ مارا جائے۔ میں ماضی سے سبق سیکھ کر اس کا احترام کرتا ہوں' میں زخم در زخم' درد در درد کا متحمل نہیں

ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں نفرت کا جواب محبت سے دینا چاہیے' تشدد کا جواب امن سے اور تصادم کا جواب مصالحت سے دینا چاہیے۔

آج خدا نے ہمیں اور کوئی چوائس نہیں دی' ایک وقت تک جب ہمارے اجداد کو ان جیسے انسانوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا' وہ شاید یہ کہنے کے متحمل ہو سکتے تھے کہ ''ہم سچے اور باقی دنیا جھوٹی ہے۔'' ہم اس صورتحال میں زیادہ دیر نہیں رہ سکتے' ہم شعوری طور پر اختلاف کی حالت میں رہ رہے ہیں' ہماری زندگی' تحفظ' ماحول اور ہمارا مستقبل ان ملکوں سے جڑا ہے جن کی ثقافت مختلف ہے۔ خدا نے ہمیں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باہم انحصار کی دنیا میں لا کھڑا کیا ہے اور اب وہ ہم سے کہہ رہا ہے کہ: کیا ہم کسی اور کی آنکھ میں خدا کا تصور پہچانتے ہیں جو ہماری آنکھوں میں نہیں؟ کیا تم میرے اتحاد کو اپنے تنوع سے بکھیر سکتے ہو؟

یہودیوں اور عیسائیوں کو باہم ملانے کے لیے 60 لاکھ افراد کی جانیں کام آئیں گی۔ ایک دوسرے کو سمجھنے اور مل کر رہنے کے لیے مشرق وسطیٰ' کشمیر' شمالی ائرلینڈ اور بلقان میں مزید کتنے لوگوں کا خون بہایا جائے گا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم تہذیبوں کے تصادم کی بجائے تہذیبوں کے احترام کے نظریے کو فروغ دیں اور دشمنوں کو دوستوں میں بدلنے کے مشکل کام کا آغاز کریں۔

باب 18

مکالمے کے ذریعے سلامتی

ملکہ نور آف اردن

ایک دہائی سے زائد عرصہ گزر چکا ہے جب 1993ء میں سموئیل ہنٹنگٹن نے پہلی بار اپنے مضمون میں تہذیبوں کے تصادم کی بات کی تھی۔ اس سال جون میں اور میرے شوہر شاہ حسین واشنگٹن میں تھے' یہ ہمارا صدر بل کلنٹن سے ملاقات کے لیے وائٹ ہاؤس کا پہلا سرکاری دورہ تھا۔ جنگ خلیج ختم ہو چکی تھی لیکن امریکی فضائیہ کے عراق پر فضائی حملے جاری تھے۔ مجھے یاد ہے کہ وہاں امریکی وزیر خارجہ وارن کرسٹوفر شاہ حسین سے کہہ رہے تھے کہ امریکہ نے سابق صدر بش سینئر کو اپریل میں دورہ کویت میں قتل کرنے کی سازش کے جواب میں عراق پر ایک اور میزائل حملہ کیا ہے اور انٹیلی جنس ہیڈ کوارٹر کو نشانہ بنایا ہے۔ اسی موسم گرما میں عبوری معاہدہ اوسلو کو توڑ دیا گیا اور اس کے بعد 1994ء میں اعلان واشنگٹن پر دستخط کیے گئے۔

لیکن افسوس' اس وقت اور اب بھی مشرق وسطیٰ میں امن ایک خواب ہے۔ جیسا کہ میں فلسطین اور اسرائیل کے درمیان اختلافات ختم کرانے کے لیے اپنے شوہر شاہ حسین کی انتھک کوششوں کو یاد کرتی ہوں' یہ دراصل تہذیبوں کا تصادم نہیں بلکہ سیاسی مفادات کا تصادم ہے۔ خطے کے اندر سیاسی تنازعات' امریکہ اور خطے کے درمیان تنازعات اور ملک کے ملک کے ساتھ اختلافات امن کی راہ میں رکاوٹ ہیں اور میں نے سابق یوگوسلاویہ میں کروشیائی باشندوں' مسلمانوں اور سربوں کے درمیان حالیہ برسوں کے دوران شدید لڑائی کا بھی مشاہدہ کیا۔ مجھے اس لڑائی کے شروع میں مغرب کی طرف سے بوسنیائی مسلمانوں کی امداد میں ناکامی پر افسوس ہوا۔ میں بھی کوئی مدد نہ کر سکی اور اس

گروہی لڑائی کو مستقبل کی خطرناک مذہبی جنگ کی علامت کے طور پر دیکھتی رہی۔ یہ وہی قبائلی اور ثقافتی اختلافات تھے جس کے بارے میں پروفیسر ہنٹنگٹن نے تصادم کی وارننگ جاری کی تھی۔

آج تہذیبوں کے مابین تصادم کی اصطلاح اسلام اور مغرب کے درمیان کشیدگی کا مختصراً استعارہ بن چکی ہے۔ کثیر پہلوی اور پیچیدہ تاریخ کو بیان کرنے کا شارٹ کٹ' میں یہ سمجھتی ہوں کہ مشرق وسطیٰ اور امریکہ کے درمیان اختلافات کو تہذیبی تفاوت کا شاخسانہ قرار دینا قطعی غلط ہوگا' لیکن اس تصادم کو نظرانداز کرکے ہم اس گہری مفاہمت کا اہم موقع کھودیں گے جو ہم آہنگی کی سمت میں پہلا قدم ہے۔

ایک ایسے فرد جس کی جڑیں مشرق اور مغرب دونوں میں ہوں کی حیثیت سے میری بلوغت کا زیادہ عرصہ عرب اور امریکی ثقافت میں پل قائم کرنے میں گزرا' اس بحث میں میرا مطمع نظر تھوڑا مختلف ہے۔ میرے نزدیک یہ تصادم عیسائیت اور اسلام یا مغرب اور مشرق کے درمیان نہیں بلکہ عدم برداشت اور مفاہمت والی قوتوں کے مابین ہے۔ اقوام متحدہ اور انسانی حقوق کی تنظیموں میں کام کرنے کے لیے میں نے دیکھا کہ بارہا افراد' سیاسی بلاکوں حتیٰ کہ بعض ممالک کی طرف سے یہ کہہ کر مفاہمتی عمل کو کچلا گیا کہ دنیا میں صرف وہی سیاہ وسفید کرسکتے ہیں۔

کسی کلچر کسی عدم برداشت یا نیکی پر اجارہ داری نہیں ہوتی۔ یہ خصوصیات کسی جغرافیے یا مذہب سے منسلک نہیں سمجھی جاسکتیں' امن و رواداری کے حامی تمام مذاہب میں تلاش کیے جاسکتے ہیں تاہم دوسرے فریق کا نقطہ نظر سننے والوں اور اس سے احتراز برتنے والوں کے درمیان عظیم خلیج موجود ہے۔

سب سے بڑے جارح وہ لوگ ہیں جو طاقت کے ذریعے اپنے مؤقف کو درست تسلیم کرانا چاہتے ہیں۔ انسانی تاریخ میں عظیم ترین بے انصافی اس وقت واقع ہوتی ہے جب لوگ یہ یقین کرنے لگتے ہیں کہ اپنے نظریے کے نام پر وہ دوسرے افراد کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ کوئی بھی آئیڈیالوجی طاقت کی ہوس اور خود کو تحفظ دینے کا باعث ہوسکتی ہے' جیسا کہ آمر کرتے ہیں۔ یہ مردانہ پہلو کا حامل پدرسری ہوسکتی ہے' خواتین پناہ گزینوں پر جبر کا تماشا دیکھتے ہوئے صرف اپنی بہتری کا سوچا جائے یا پھر یہ نام نہاد دفاعی پالیسی ہوسکتی ہے جو تمام منحرفین کو پیشگی نشانہ بنانے کی

تحریک دیتی ہے۔ یہ تمام دلائل ایک یا دوسرے طریقے سے بے انصافی اور تنازعے کے جواز کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔

چونکہ عقیدہ انسانی اعمال کا بنیادی محور، انارکی اور شرپسندی کا جواز ہوتا ہے اور اکثر مذہب کی زبان کی چادر اوڑھے ہوتا ہے۔ آج ہم دیکھ سکتے ہیں کہ متعصب اقدامات نے کس طرح حضرت محمد ﷺ کے عظیم فلسفے کو اپنے مقاصد کے لیے یرغمال بنا رکھا ہے، تاہم اسلام کی بنیاد پرستی پر کوئی اجارہ داری نہیں۔ عیسائیت نے نہ صرف صلیبی جنگوں کے دور میں بلکہ حالیہ عرصے میں بھی ''مقدس جنگ'' کا علم بلند کیا، حالیہ دور میں بلقان میں مذہب کے نام پر مخالف عقیدے کی نسل کشی کی گئی، المیہ یہ ہے کہ یہودیوں میں بھی انتہاپسند ہیں جو تشدد کے ذریعے اپنے مذہبی یوٹوپیا کا وژن آگے بڑھاتے ہیں۔ انہی میں ایک سابق اسرائیلی وزیراعظم اسحاق رابن شامل ہیں جنہوں نے امن کے قیام کی جرأت کی تھی۔ امریکہ میں بھی انتہاپسند آریان گروپ کی طرف سے دہشت گردی کی دھمکیاں جاری کی جاتی ہیں، انہوں نے عرب اور اسلامی نظریے کے برخلاف اپنے عیسائی نظریے کو توڑ مروڑ رکھا ہے، لیکن کسی مخصوص مذہب کو اس نقطۂ نظر سے الگ تھلگ کرنا کہ اسے برائی کی ڈھال کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس قسم کی سیاہ وسفید سوچ ہے جو جارحیت کو شہہ دیتی ہے۔

یقین کیجیے، تینوں ابراہیمی اور دیگر مذاہب کو لاحق خطرات بہت حقیقی ہیں۔ یہودی مخالف سوچ ایک دور میں یورپ میں پورے عروج پر تھی۔ چین، شمالی کوریا، سوڈان اور پاکستان میں مذہبی طور پر اقلیت عیسائیوں کو قانونی موشگافیوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اسی طرح کئی مقامات پر مسلمان یہ سوچتے ہیں کہ ان کی ثقافت خطرے میں ہے، بالخصوص نائن الیون کے بعد مغرب میں اسلام کے حوالے سے بداعتمادی میں اضافہ ہوا ہے، ان حالات میں کئی ہزار چہروں کے لیے تہذیبوں کے تصادم کی بات کرنا آسان ہو جاتا ہے، اور وہ یہ کہتے ہیں کہ تبدیلی ممکن نہیں اور یہ کہ ثقافتی اختلافات ایک طے شدہ امر ہیں، اور یہ کہ کسی قسم کا مکالمہ اس تنازعے کے حل کا باعث نہیں بن سکتا اور یہ کہ ان بحرانوں کا حل طاقت کی سیاست اور طاقت کے استعمال کی دھمکی میں ہی مضمر ہے۔

میرا نقطہ نظر بالکل مختلف ہے، تمام قسم کے اعتدال پسندوں کو اپنی عالمگیر اقدار مجتمع کر کے مذہب کی آڑ میں نفرت پھیلانے والوں کو مسترد کر دینا چاہیے۔ ہمیں ''تہذیبوں کے درمیان تصادم'' کے

خیال کوحقیقت بننے کی اجازت نہیں دینی چاہیے اوران لوگوں کے خدشات کوتقویت نہیں دینی چاہیے جو سیاہ وسفید انداز میں سوچتے ہیں۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کے تشدد سے متعلق اخباری رپورٹنگ سازش کے گھناؤنی نظریات کو ہوا دیتی ہے اور قربانی کے بکروں کے نام پیش کرتی ہے۔ایسی غیر محدوداخباری رپورٹوں میں یہ چیز ناپید ہوتی ہے کہ اسلام بذات خود پرتشدد عدم رواداری یا بند ذہن کا حامل مذہب نہیں قرآن اپنے دفاع کے سوا تشدد سے روکتا ہے۔ ارشاد ہے ''اللہ جارح افراد کو پسند نہیں کرتا۔'' اور''ظالم کے سوا کسی کے ساتھ پرتشدد رویہ اختیار نہ کرو۔'' قرآن عظیم وحدانی مذاہب یہودیت اورعیسائیت کے ساتھ قرابت داری کی اجازت دیتا ہے اورانہیں اہل کتاب قرار دیتا ہے۔اسلام نہ صرف اہل کتاب کی مشترکہ حیثیت بلکہ ان کی رنگارنگی بھی تسلیم کرتا ہے اورمسلمان پر زور دیتا ہے کہ وہ دیگر ثقافتوں کا احترام کریں۔''اے بنی نوع انسان' ہم نے تمہیں ایک مرد و عورت کے جوڑے سے پیدا کیا' اور تمہارے قبیلے اورنسلیں بنائیں تا کہ تم ایک دوسرے کی پہچان کرسکو(نہ کہ ایک دوسرے پر نسلی تفاخر کا اظہار کرو۔'')

رواداری اور مساوات کی بنیادوں پر قائم اسلام اس وقت بھی انسانی حقوق کا علمبردار رہا جب انسانی اداروں میں اس کا تصور بھی نہیں پایا جاتا تھا۔ اسلام کے ابتدائی سنہری دور میں پوری اسلامی دنیا میں مذہبی آزادی پائی جاتی تھی۔محض چند مغربی باشندوں کوعلم ہوگا کہ ساتویں صدی کے اسلام میں خواتین کو سیاسی' قانونی اور وہ سماجی حقوق حاصل تھے جن سے مغرب قطعی نا آشنا تھا۔ دوسری طرف امریکہ میں خواتین بیسویں صدی تک اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرتی نظر آتی ہیں۔ابتدائی دور کے اسلام میں جائیداد رکھنے اور وراثت میں منتقل کرنے' کاروبار کرنے' شادی کی ممانعت نہ ہونے اور خدا کے حضور مرد وزن کی یکساں حیثیت جیسے حقوق حاصل تھے اور یہ سب کچھ اس دور میں حاصل تھا جب باقی دنیا عورتوں کو کمتر سمجھتی تھی۔

حتیٰ کہ حالت جنگ میں بھی اسلام نے انتہائی برداشت کا درس دیا۔قرآن پاک اور حضرت محمدﷺ نے دوٹوک انداز میں جنگ کے دوران انصاف' احترام آدمیت اور رحمدلی کا حکم دیا۔ اسلام قیدیوں سے حسن سلوک پر زور دیتا ہے' انہیں مناسب خوراک' لباس کی فراہمی کے ساتھ ساتھ جنگ کے معاملات طے پانے پر عزت واحترام سے رہا کرنے کا حکم دیتا ہے۔ یہ وہ حقوق ہیں جو آج بھی

مغرب میں ''دشمن فوجی'' کو دستیاب نہیں ہیں۔ سکولوں کے طلباء کو کئی نسلوں سے خلیفہ رسول حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ قول پڑھایا جاتا ہے: جنگ کے دوران فریب نہ کرو' دھوکہ نہ دو' کسی کے اعضا نہ کاٹو' بوڑھوں' عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کرو' املاک نذر آتش نہ کرو' پھلدار درخت نہ کاٹو۔ اگر مخالف لوگ چرچ میں پناہ لے لیں تو انہیں بخش دو۔

اسی طرح وہ لوگ جو ان دنوں یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام جمہوریت کے تصور سے دور ہے کو عبدالکریم سروش جیسے سکالروں کو قریب سے پڑھنا چاہیے۔ اسلام اجتہاد' اجماع اور شوریٰ کا سبق دیتا ہے۔ کمیونٹی سے مشاورت کا عمل شوریٰ جمہوری روایت کا مظہر ہے' یوں جمہوری اجتماعیت کی اقدار اور رواداری ہر لحاظ سے اسلام سے مطابقت رکھتے ہیں۔

ہمیں بنیاد پرستوں کے بارے میں بنیاد پرست ابہام نہیں رکھنا چاہیے' امتحان اس وقت شروع ہوتا ہے جب کسی شخص کے اصول دیگر افراد کے حقوق اور ضرورتوں سے متصادم ہوتے ہیں۔ اپنے عقائد پر مر جانے کی خواہش ایک اور چیز ہے جبکہ اپنے نظریات کے لیے کسی کو مارنے پر اتر آنا مختلف چیز ہے۔

بدقسمتی سے عدم رواداری عقلیت کے مقابلے میں آسان ہوتی ہے۔ یہ خطرات کا شکار افراد کے لیے سکون کا باعث ہوتی ہے' ایک طرف مغربی باشندے ہیں جن کے پاس کھونے کے لیے بہت کچھ ہے دوسری طرف پناہ گزین ہیں جو تہی دامن ہوتے ہیں۔ چاہے مشرق وسطیٰ کے کسی آمر کی طرف سے ہو یا مغربی سیاستدان کی طرف سے ہو پناہ گزینوں سے نفرت کا اظہار کرنا داخلی مسائل سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کا ہتھکنڈہ ہوتا ہے' جب کشیدگی عروج پر پہنچ جاتی ہے تو اعتدال پسند بھی ...... بند ذہنوں اور مفاہمت سے گریز کو دیکھ کر...... فریق بن سکتے ہیں۔ یوں وہ مرکز سے دور ہو کر انتہا پسندوں کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔

انتہا پسندی بھی مایوسی' بددلی اور غصے سے فروغ پاتی ہے۔ وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے پاس کھونے کے لیے کچھ نہیں بچا مایوس کن اقدامات پر اتر آتے ہیں۔ اپنے طویل تجربے کی روشنی میں' میں بھانپتی ہوں کہ ہمارے خطے میں اکثریت آزادی اور اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے حق سے محروم ہے' سوا دو سو سال پہلے حریت پسندوں کے ایک گروپ نے زندگی' آزادی اور مسرت کے

لیے جنگ شروع کی، مشرق وسطیٰ کے لوگ اس سے کم کے مستحق نہیں تھے، دیگر اقوام کی طرح ان کے نزدیک بھی حقیقی سلامتی آزادی کے احساس، امید اور موقع سے عبارت ہے۔ سلامتی ہی امن کا منطقی ذریعہ ہوتی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ تین باہم منسلک حلیفی تعلیم، مکالمے اور عمل کے ذریعے سلامتی کا حصول ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں جاری ہونے والی نئی ریسرچ میں ان معاملات پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے عرب ومغرب کے تعلقات اور سکیورٹی سے تعلق کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اول عرب ہیومن ڈویلپمنٹ رپورٹ 2000: بلڈنگ اے نالج سوسائٹی، دوم کئی ممتاز عرب سکالروں اور مفکرین کی تحریروں میں بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح خطے کے لوگ اپنے مسائل کے خود حل کے لیے مزید ذمہ داری اٹھا سکتے ہیں۔ 2002ء میں پہلی رپورٹ کے بعد خلیج میں انسانی ترقی کی راہ میں حائل جن رکاوٹوں کی نشاندہی کی گئی ان میں محدود آزادیاں، خواتین کے حقوق اور تعلیم شامل ہیں...... 2003ء کی رپورٹ میں تعلیم کی انتہائی ضرورت کا گہرائی تک جائزہ لیا گیا۔ 2003ء کی ایک دستاویز ہے جس کا عنوان تھا "Changing Minds, Winning Process" اس امریکی رپورٹ میں سکیورٹی کے امور میں عوامی سفارت کاری کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے، اس میں عربوں کی تعلیم اور اطلاعات تک رسائی کا ذکر کرتے ہوئے امریکہ سے عربوں اور مسلمانوں کی آواز پر کان دھرنے ......اور میں خود اس پر زور دوں گی...... کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

دونوں رپورٹوں میں بتایا گیا ہے کہ مشرق اور مغرب میں تعلیم اور کمیونیکیشن کا گہرا فرق پایا جاتا ہے اور اس خلیج کو پاٹنے کی ضرورت ہے۔ ہر فریق کو تعلیم سے بہرہ مند ہو کر اسے دوسرے فریق تک پہنچانا چاہیئے۔ تعلیم طویل المدت لحاظ سے انتہائی طاقت ور چیز ہے۔ شاید ہتھیاروں سے بھی زیادہ طاقتور، ایک طرف جہاں یہ لوگوں کو تیزی سے پیچیدہ ہوتے ماحول میں زندگی بسر کرنے کی مہارت فراہم کرتی ہے وہاں یہ ہم سب کو جدید دنیا کے سب سے اہم ذریعے یعنی انسانی ذہن کی ترقی کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر تعلیم عالمی سلامتی کا ایک انتہائی مؤثر ہتھیار ثابت ہو سکتی ہے۔

خطے میں صلیبی جنگوں سے نو آبادیاتی دور تک غیر ملکی مداخلت کی تاریخ کی روشنی میں عرب اور مسلمان بالعموم مغرب کے عزائم پر بداعتمادی کا اظہار کرتے ہیں، تاہم 80 فیصد لوگ اب بھی مغرب

کے تعلیمی نظام' ریسرچ اور ٹیکنالوجی کے معترف ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں امریکہ سے الحاق شدہ ادارے نہ صرف مغربی تدریسی نظام کا نمونہ ہیں بلکہ شفافیت' اجتماعیت اور جمہوری روایت کا مظہر ہیں۔ یہ متاثر کن اور زبردست سیاسی آئیڈیل امید ہے عرب خطے میں جڑ پکڑے گا' امریکہ کے ساتھ تبادلے کے پروگراموں اور سکالرشپ نے خطے میں تعمیری اثرات مرتب کیے ہیں۔امریکہ کے ان تبادلہ پروگراموں میں دنیا کے 200 موجودہ یا سابق سربراہان حکومت اور 1500 وزراء ملوث ہیں۔ اس مؤثر ادارے کے قیام کا مقصد مغرب کے بارے میں رائے عامہ اور رویہ بہتر بنانا ہے۔ علم و تدریس کو اسلام میں نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔لیکن چیختی چنگھاڑتی اخباری رپورٹوں میں مدارس کو دہشت گردی کے تربیتی مراکز کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ایک ہزار سال قبل اسلام کے سنہری دور میں خودمختار' تخلیقی اور تجزیاتی سوچ پروان چڑھائی گئی' جو ایک وسیع تر دنیا سے مربوط تھی' اسی نے مغرب کی لبرل تعلیم کا بیج بویا تھا۔ دانشوری کے لیے اسلام کا میلان مشرق میں نئے ''خیالات'' کے فروغ کا باعث بنا' ان خیالات کا دائرہ ریاضی سے موسیقی سے ادویہ تک پھیلا ہوا تھا۔ اسلام نے عرفان' انصاف' مساوات' انٹلیکچوئل تخلیقیت اور انسان نواز معاشرے کا تصور دیا' اور علم کے فروغ کے ذریعے یورپ کو جہالت کے دور سے نکلنے میں مدد دی گئی۔ بارہویں صدی کے نکتہ دان الفارابی' ابن سینا' ابن رشد کے فلسفے نے مغرب کے سیاسی نظام کو نئے افق سے روشناس کرایا' آج اس قسم کی نشاۃ ثانیہ' وسیع النظر تعلیم اس سکیورٹی کو یقینی بنا سکتی ہے جس کے ہم متلاشی ہیں۔

امن سے متعلقہ تعلیم لوگوں کو ان کے ذہن کھولنے میں مدد دے سکتی ہے' اس طرح وہ درست سوال کر سکتے ہیں اور دنیا کو کسی اور کے نقطہ نظر سے دیکھنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ ایسی تعلیم انہیں تشدد کے بغیر اپنی آوازیں قابل سماعت بنانے کی صلاحیت بہم پہنچا سکتی ہے۔

میں نے خود اپنے خطے (مشرق وسطیٰ) میں ماضی کی دشمنیوں کو ختم ہوتے دیکھا ہے۔ نئی نسل کے نوجوانوں کو اعتماد کی فضا میں رابطے بڑھانے کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ مثال کے طور پر 1993ء میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں پہلے بم دھماکوں کے بعد ''امن کے بیج'' ادارے کی بنیاد رکھی گئی' جہاں اس وقت تنازعات کی زد میں اس خطے کے نوجوانوں کو جہالت اور زیادتی کے خلاف ایک دوسرے کے قریب

لایا گیا۔ایک وقت کے لیے وہ اکٹھے رہے اور باہمی مفاہمت اور احترام کے فروغ کے لیے مل کر کام کرتے رہے تاکہ کمیونیکیشن کے ذریعے تصادم پر حاوی ہوا جاسکے اور جب وہ واپس اپنے اپنے گھروں میں گئے تو بھی انہوں نے اپنے ہاتھ اور دل ایک دوسرے کی طرف بڑھائے رکھے' بدترین تشدد کے دوران بھی سیڈز آف پیس کے گریجوایٹ فون یا ای میل کے ذریعے آپس میں رابطے رکھتے' انہوں نے اپنے طرز عمل سے اپنے رشتہ داروں اور ہمسائیوں کو بھی متاثر کیا اور انہیں انسانیت اور امید کے لیے چانس لینے کی تحریک دی' انہوں نے اپنے چہرے پر نفرت کا نشان قبول کرنے سے انکار کر دیا' وہ اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں کہ لوگ اپنے وطن میں رہ کر اپنے ملک اور ہمسائیوں سے محبت کر سکتے ہیں۔

امن کی تعلیم کی تحریک جڑ پکڑ رہی ہے' اس وقت امریکہ میں 100 سے زائد کالج اور یونیورسٹیاں اس ضمن میں کردار ادا کر رہی ہیں۔ عالمی سطح پر یونیسکو کا پرائز فار پیس 24 ویں برس میں داخل ہو چکا ہے۔اس کے علاوہ طویل لیڈرشپ اکیڈمی جیسے چھوٹے ادارے بھی مصروف عمل ہیں۔ بوسنین کڈز آن لائن اور آئی ٹو آئی جیسی ویب سائٹس جدید مواصلاتی ٹیکنالوجی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فزیکل اور نفسیاتی دونوں رکاوٹوں کو ختم کر کے فلسطینی پناہ گزین کیمپوں میں بچوں کی حالت زار بہتر بنانے کا کام کرتی ہیں۔ مجھے مختلف پس منظر کے حامل طبقات کو قریب لانے کے لیے مصروف کار۔ اداروں یونائیٹڈ ورلڈ کالجز نیٹ ورک' مک رگل مڈل ایسٹ پروگرام اور یونائیٹڈ نیشن انٹرنیشنل لیڈرشپ اکیڈمی عمان جیسے اداروں کے ساتھ کام کرنے کا شرف حاصل ہے۔ یہ تمام ادارے مختلف پس منظر کے حامل افراد کو ایک دوسرے کو سننے کا موقع دینے اور اداروں کے فروغ کی بنیاد پر استوار ہیں۔امن صرف خیر سگالی اور مفاہمت سے فروغ نہیں پاتا بلکہ مختلف نیٹ ورکس سے منسلک پرعزم افراد کے مابین رابطوں اور مسائل کے حل کے لیے وسائل کے اشتراک سے بھی ٹھوس نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ یہ تعاون خطوں' ممالک اور کمیونسٹوں سے ماورا بھی ہوسکتا ہے۔

حقیقی معنوں میں دوسروں کو سننے کی صلاحیت اور احترام پر مبنی مکالمے کے بغیر امن کی تعلیم حتیٰ کہ خود امن بھی حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ مباحثہ جس میں ایک فرق بالآخر جیت جاتا ہے کے برعکس مکالمہ تصادم کے لہجے سے بالاتر ہو کر رواداری کی آوازیں سننے کا نام ہے۔

حالیہ مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسا ممکن ہے بلکہ مثبت بھی ہوتا ہے' کئی لوگ ایسے مکالمے کی حوصلہ افزائی کے لیے جرأتمندانہ قدم اٹھا رہے ہیں' نومبر 2003ء میں تیار ہونے والا معاہدہ جینوا مشرق وسطیٰ میں تشدد اور سیاسی جمود سے تنگ لوگوں کے درمیان تعاون کا ثمر تھا' ان لوگوں نے سیاسی قیادت غیر لچکدار انتہاپسندی کو مسترد کر کے سمجھوتے کی اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کیا۔جیسا کہ اس معاہدے کے ایک مؤسس سابق فلسطینی وزیر اطلاعات یاسر عبادربو کہتے ہیں: ''آج ہم امن کے بدلے امن کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا رہے ہیں' ہمارے ناقدین کہتے ہیں' سول سوسائٹی کی بجائے فلسطینی حکام کو ایسے سمجھوتے کرنے چاہئیں' لیکن اگر سرکاری حکام آپس میں نہیں ملتے تو ہم کیا کریں گے' ہم بیٹھے انتظار نہیں کر سکتے کیونکہ دونوں قوموں (فلسطین و اسرائیل) کا مستقبل تباہی کے دہانے کی طرف بڑھ رہا ہے۔''

میرے شوہر (مرحوم) شاہ حسین جو دنیا کے ایک سینئر سٹیٹس مین اور امن معاہدوں کے محرک ہیں نے مختلف لوگوں کو ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے Inspire کیا' ان کا یہ پختہ یقین تھا کہ امن حکومتوں کے درمیان نہیں بلکہ عوام کے مابین قائم کیا جا سکتا ہے۔ یہ صرف کاغذات کے پرزوں پر نہیں لکھا جا سکتا بلکہ اسے لوگوں کے دلوں پر نقش ہونا چاہیے' وہ لوگ جو ایک ساتھ رہتے ہیں اور حقیقی' دیرپا امن کے لیے قربانیاں دیتے ہیں۔

معاہدہ جینوا کی بنیاد اسی نظریے پر تھی' دنیا کے 58 سابق سربراہان حکومت' صدور' وزرائے خارجہ اور دیگر عالمی رہنماؤں نے اس کی حمایت کی لیکن اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ امن عمل کے لیے اپنے لیڈروں کے اشتراک عمل کے منتظر اسرائیلی و فلسطینی عوام بھی اس سے اصولی طور پر متفق تھے۔اگرچہ اس معاہدے کو سیاسی طور پر تعلیم کرنے کی پابند نہیں بنایا گیا لیکن یہ اس بات کا غماز تھا کہ سول سوسائٹی جمود توڑنے اور اعتماد سازی کے لیے طاقتور محرک ثابت ہو سکتی ہے۔

دیگر سول گروپ بھی اس طرح تنازعات کی دیواریں عبور کر رہے ہیں۔ایک تنظیم Women waging peace نے امن پسندوں کا ایک فورم بنایا ہے جو جدید ٹیکنالوجی کی قوت سے تباہ حال معاشروں کی تصادم سے بحالی کے لیے سیاسی اور نظریاتی رکاوٹیں دور کرتا ہے۔

گوئٹے مالا میں تنظیم ''ویژن گوئٹے مالا'' کے بانی کا کہنا ہے کہ:

''سننے اور بولنے سے تبدیلی لا کر دنیا کو بدل ڈالو۔'' اس طرح ایلسلو اڈور میں ریڈیو پروگرام کلچر آف پیس ماضی کے متحارب دھڑوں کو قریب لا رہا ہے۔ فلپائن میں ''کسوگ منڈناؤ'' اقلیتی مسلمانوں سے رابطے کرتا ہے' خطہ بلقان میں دونوں طرف کی مائیں اکٹھی ہوئیں اور کہا ''ہم سب مائیں ہیں اور ماتم کناں ہیں۔'' سیرالیون میں عورتیں عسکری گروپوں میں شامل بچوں کو اس لعنت سے چھٹکارا دلانے کے لیے آگے بڑھی ہیں' اس طرح اور کئی مقامات پر مرد و خواتین اور بچے طویل عرصے سے جاری تنازعات کے زخم بھرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

ان سب سے بڑھ کر سرحد پار مکالمے کی سب سے اولین مثال اقوام متحدہ ہے۔ 25 سال سے اقوام متحدہ کے مختلف فورموں پر کام کرتے ہوئے میں نے بھوک افلاس سے لے کر پناہ گزین بچوں کی دیکھ بھال اور دیگر کئی امور پر کام کیا' میں تصدیق کر سکتی ہوں کہ اقوام متحدہ درپیش چیلنجوں سے قطع نظر انسانی تعاون کی تاریخ کا مؤثر ترین ہتھیار ہے' جو اس اصول کی بنیاد پر قائم ہوا کہ دنیا اقوام پر مشتمل ایک خاندان ہے' اس نے کئی مواقع پر واضح کیا کہ کسی خاندان کی قوت غیر محدود رابطوں سے منسلک ہے۔

بلاشبہ پراپیگنڈا یا مسخ شدہ تعلقات عام نہیں بلکہ رابطے (کمیونیکیشن) کامیابی کی کنجی ہے۔ ایسے اقدامات چاہے کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں کو جب دوسرے کا نقطہ نظر تبدیل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوتے لیکن جب ادارے سنتے ہیں' اور مشترکہ پس منظر تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں......اور حتیٰ کہ جب اتفاق رائے حاصل نہیں بھی ہوتا وہ اختلاف رائے کو اہمیت دیتے ہیں' وہ ایسے مکالمے کی راہ اختیار کرتے ہیں جو موقع کی دعوت دیتا ہے' یہ صرف خیر سگالی کے معاملہ نہیں بلکہ تحفظ اور خوف کے خاتمے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ تعلیمی و ثقافتی پروگراموں کا تبادلہ روکنے' سفری سہولتوں میں پابندیاں لگانے اور ویزے کی مشکلات سے محض کشیدگی اور عدم مفاہمت ہی بڑھتی ہے' جبکہ تعلیم' ٹیکنالوجی' سرحد پار خیالات اور ثقافت کا تبادلہ انٹرنیشنل سکیورٹی کے لیے انتہائی مؤثر ہے' دفاعی سکیورٹی کے نئے اقدامات بالواسطہ طور پر سکیورٹی کو انتہائی نقصان پہنچا رہے ہیں۔

جنونیت کے خلاف لڑائی میں ایک انتہائی اہم اخلاقی عنصر بھی ہے، جس کے بغیر دیگر دو عناصر کی

چنداں اہمیت ہے: وہ ہے عمل...... کوئی بھی تعلیمی پروگرام اور تنظیم کمیونیکیشن کی کوششیں اس وقت تک مؤثر ثابت نہیں ہوسکتیں جب تک عملی اقدامات نہ کیے جائیں' جب تک فلسطینی علاقوں پر قبضہ ختم نہیں کیا جاتا تب تک امریکہ یا مغرب کی مشرق وسطیٰ کے لیے کوئی بھی پالیسی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ امریکی فوجوں کی عراق میں موجودگی تک مشرق وسطیٰ میں ثقافتی اختلافات میں پل تعمیر نہیں کیا جاسکتا۔

جدید مغربی کلچر کے اہم ترین پہلو برداشت' آزادی' جمہوریت اور انسانی حقوق ہیں لیکن بدقسمتی سے پوری دنیا کے لوگ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو ان خصوصیات سے عاری دیکھ رہے ہیں جو وہ اپنے تحفظ کے لیے ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ یقیناً مشرق وسطیٰ میں ارباب اختیار کو اقلیتی طبقے کی طرف سے تشدد سے نمٹنا ہوگا اور اعتدال پسند سیاسی قوتوں کی حوصلہ افزائی کرنی ہوگی۔ انسانی حقوق اور معاشی شعبے کا تحفظ کرنا پڑے گا اور فوجی تیاریوں پر دیرپا ترقی کو ترجیح دینا ہوگی۔ لیکن نام نہاد تصادم کے تناظر میں دوسرے فریق کو بھی یہ سب کچھ کرنا ہوگا۔

سکیورٹی الفاظ (قول) کے ساتھ عمل کی متقاضی ہے لیکن عمل یکطرفہ اور مبہم نہیں ہوسکتا۔ یہ لازماً مشترکہ' مثبت اور تعاون پر مبنی ہونا چاہیے۔ حالیہ واقعات نے واضح کیا ہے کہ بین الاقوامی اشتراک کے بغیر بین الاقوامی عمل کامیاب نہیں ہوسکتا' اس کے ساتھ' ساتھ جب کوئی ملک یکطرفہ طور پر کسی دوسری قوم پر چڑھائی کرتا ہے تو غم وغصہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ بات طے ہے کہ کوئی واحد طاقت اپنے طور پر دنیا کے مسائل حل نہیں کرسکتی' اخلاقی' قانونی اور عملی طور پر ایسی مداخلت کی بنیاد بین الاقوامی ضابطوں اور ادارہ جاتی اتفاق بالخصوص اقوام متحدہ کی رضامندی پر استوار ہونی چاہیے۔

جب آپ یہ کہتے ہیں ''اگر آپ ہمارے ساتھ نہیں تو آپ دراصل ہمارے خلاف ہیں۔'' تو اس کا مطلب ہے تنازعات کی آگ پر مزید تیل چھڑکا جائے۔ یہ عمل چاہے کسی مسجد کے منبر سے وقوع پذیر ہو یا ایوان صدر سے ہو' بہرصورت فائدہ مند ثابت نہیں ہوتا۔

صابر اعتدال پسند ہونا مشکل ہے لیکن ہمیں ہر جگہ آج اس کی ضرورت ہے۔ یہ بالخصوص اس لیے مشکل ہے کیونکہ اداروں کو اس کی روح کے لحاظ سے مسلط نہیں کیا جاسکتا۔ انتہا پسندی اور نصف سچ کی بناء پر کسی کی خدمت کرنے میں پناہ لینا مناسب عمل نہیں' لیکن کسی مخالف فریق بالخصوص

دوسرے کلچر کی بات پر کان دھرنا انتہائی متوازن اقدام ہے۔ موردالزام ٹھہرانا اور صبر کرنا بیک وقت ساتھ چل سکتے ہیں۔

11 ستمبر 2001ء جسے اقوام متحدہ کے تحت عالمی یوم امن قرار دینے کی توقع ہے' تہذیبوں کے مابین مکالمے کے آغاز کا استعارہ ہے حقیقت یہ ہے کہ تاریخ بذات خود عدم رواداری کی قوتوں کے ہاتھوں یرغمال بنی رہی۔ چند افراد کے جنون نے 11 ستمبر کو ہزاروں زندگیاں برباد کیں۔ ان میں 200 مسلمانوں سمیت 70 قوموں کے افراد شامل تھے' جب نفرت اور انتہاپسندی کی آوازوں کو اعتدال پسندی سے ڈبو دیا جائے تو مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔

ہمیں اس وقت تہذیبوں کے نئے تصادم کا سامنا نہیں' ہم تہذیب کو غیرانسانی رویوں کے خلاف جدوجہد کرتے دیکھ رہے ہیں' جنونیت نے ہمیشہ انسانیت کو مطعون کیا لیکن ہم اس کے لیے انسانیت کو چھوڑ نہیں سکتے' نہ ہی ہم خود کو نظریے کے کمبل میں سکون پہنچا سکتے ہیں تاکہ ہم سخت سوالات سے بچ رہیں۔ تعلیم' کمیونیکیشن اور عمل کے ذریعے رواداری اور ہمدردی کے پیروکاروں کو مشترکہ اقدار پر ذمہ دار عالمی کمیونٹی کی تشکیل کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں دو قسم کے لوگ ہیں' ایک وہ جو انسانوں کو تقسیم کرتے اور دوسرے وہ جو ایسا نہیں کرتے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تقسیم کرنا نہایت آسان کام ہے' لیکن عالمی تنوع کی روشنی میں تہذیبوں کے مابین حقیقی مکالمہ ناگزیر ہے۔

باب19

مکالمے کی طاقت: ہماری از سرنو تعریف

تماراسون

مذاہب کے درمیان مکالمے کا تصور ہولوکاسٹ کے بعد سامنے آیا' دنیا بھر کے باضمیر افراد کی تحریک کے نتیجے میں رومن کیتھولک چرچ کی دوسری ویٹی کن کونسل نے (1962-5) مکالمے کی توثیق کرتے ہوئے اس کا تخصص تیار کیا۔ چرچ نے عیسائیت کے روایتی تخصیص کے منفی اثرات کو بھانپ لیا تھا کیونکہ اس کا نتیجہ الگ تھلگ ہونے اور سماجی تعلقات میں کمی کی صورت میں نکلا تھا' اس روایت کے نتیجے میں دیگر عقائد کے لوگوں کی طعن وتشنیع کی گئی اور ان پر نسل کشی جیسے حملے کیے گئے۔ اول الذکر مسئلے کے حل کے لیے انسانیت کو درپیش مسائل پر بھرپور توجہ دینے کی حوصلہ افزائی کی گئی جبکہ مؤخرالذکر ایشو پر مکالمے کی حوصلہ افزائی کا کام شروع کیا گیا تاکہ مختلف مذاہب کے درمیان مفاہمت کے فاصلوں کو ختم کیا جاسکے۔

ہولوکاسٹ کے سبق سے متاثر ہوکر شروع کیے گئے مکالمے کے پہلے عشرے میں یہ عمل خودمختار اور وسیع تر بصیرت سے آگے بڑھا' صدیوں سے عاری جمود پر قابو پایا جاتا تھا' اس کے ساتھ مختلف مذاہب کے پیروکاروں کئی نسلوں سے مس انفارمیشن' بداعتمادی اور شکوک وشبہات پر غالب ہونا تھا' یہ ابتدائی مکالمہ جات زیادہ تر عقائد اور روایات کی وضاحت پر مبنی تھے۔ اسی طرح پارٹنرز کی تلاش' طریقہ کار اور رہنما اصول وضع کرنے کا کام کیا گیا۔ بین العقائد ٹکراؤ کو بحث میں تبدیل کیا گیا جس کے لیے تشریحات کو درست قرار دیا گیا۔ اس دوران مذہبی بنیادوں کی جانچ پڑتال کرنا تھا تاکہ پہلے مکالمے کی قانونی حیثیت کا تعین کیا جاسکے اور پھر عقائد کے درمیان کشمکش کے دوران اٹھائے گئے ایشوز کا جواب دیا جاسکے۔

انہی ابتدائی برسوں میں مکالمے کی کوششوں کا عمل بظاہر سست نظر آیا لیکن مکالمے کی حقیقی طاقت اب واضح ہوتی جا رہی ہے۔ مکالمہ ابتدائی کوششوں سے خود آگاہی اور مشترکہ اداروں کے لحاظ سے پختہ ہوگیا ہے' اب یہ انہی وسیع تر سماجی جدوجہد سے دوبارہ رجوع کر رہا ہے جن سے اس کا جنم ہوا تھا' اس عمل میں یہ متنوع پس منظر کے حامل نئے معاشروں کو الگ تھلگ کرنے کے بحران میں مبتلا کرنے والے اسباب کی تلاش میں مدد دے رہا ہے' یہ نئے معاشرے روایتی مذہبی برادریوں کی جگہ نہیں لیتے بلکہ یہ ایسے لوگوں کو آپس میں ملاتے ہیں جو ہوسکتا ہے نسلی پہچان میں مختلف ہوں لیکن ان کی اقدار مشترکہ ہیں۔ایسا کرتے ہوئے دراصل یہ تمام عناصر پر مشتمل کمیونٹیوں کو مضبوط کرتے ہیں' عقیدے میں اختلافات کی حکمت عملی سے مشترکہ سماجی واخلاقی پہلوؤں کی طرف پیش قدمی اور معاصر مکالمہ جات سے ایسے عوامی اتحاد تشکیل پا رہے ہیں جو گروہی شناخت کی رکاوٹوں کو دور کرنے میں پرعزم ہیں اور یہ طویل عرصہ سے حل طلب تنازعات مل کر حل کر رہے ہیں۔

احمد...... پرل مکالمہ جات

اس نوعیت کے مکالمہ جات کی بہترین مثال وہ مکالمے ہیں جو دہشت گردوں کے ہاتھوں بے گناہ افراد کے قتل سے ابھرنے والے مشترکہ دکھ سے فروغ پاتے ہیں۔ان میں وال سٹریٹ جرنل کے کراچی میں قتل کیے گئے نمائندے ڈینیل پرل کے والد ڈاکٹر جوڈیا پرل اور ممتاز مسلمان سکالر اور سفارتکار اکبر احمد کے باہمی مکالمہ جات کو نمایاں حیثیت شامل ہے۔ ڈینیل پرل کو 2002ء کے اوائل میں قتل کیا گیا اور اس اندوہناک سانحے کی ویڈیو انٹرنیٹ ویب سائٹ پر جاری کی گئی۔ ان کے آخری الفاظ تھے ''میں ایک یہودی ہوں'' انتہائی کرب سے دوچار ان کے والدین نے انتقام لینے کی ٹھان لی......لیکن یہ انتقام اس طرح کا نہیں جو مشرق وسطیٰ میں یا کہیں بھی تشدد کی صورت میں نظر آتا ہے بلکہ جوڈیا پرل نے اپریل 2004ء میں کالج آف ولیم اینڈ میری میں ڈاکٹر احمد کے ساتھ مکالمے میں بتایا ''میں انتقام کی علامتی شکل چاہتا ہوں۔'' ان کا مقصد نفرت کی ان بنیادوں کی وجوہات کو سمجھنا ہے جس کی وجہ سے نہ صرف ان کے صحافی بیٹے کو موت کے گھاٹ اتارا گیا' بلکہ کئی دیگر معصوم افراد بھی قتل کیے جا چکے ہیں۔

پہلے مرحلے میں ڈاکٹر پرل نے ڈاکٹر احمد جن کی کتاب :Islam under siege نے انہیں متاثر کیا تھا سے چند استفسارات کیے۔ اول' انہوں نے کہا کہ ہولوکاسٹ کے بعد جب یہودی اسرائیل میں آباد ہوئے تو ان کے ذہن میں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ اس سے مسلمانوں کو بھی خطرہ ہے۔ کتاب میں ڈاکٹر اکبر احمد نے آج کے دور میں اسلام پر حاوی منفی پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے' اس میں بتایا گیا ہے کہ مغربی عیسائیوں نے پہلے مسلمانوں پر حملے کر کے صلیبی جنگوں کا آغاز کیا اس کے بعد عیسائی مبلغین اور نو آبادیاتی طاقتوں کے ذریعے چڑھائی کی' اس کا نتیجہ موجود دور میں بوسنیا' فلسطین' عراق' افغانستان' کشمیر اور چیچنیا کے مسلمان اب بھی بھگت رہے ہیں۔ امریکہ کے پروٹسٹنٹ رہنما اسلام اور حضرت محمد ﷺ کی ذات کے خلاف رکیق حملے کرنے سے باز نہیں آتے اور یہ دراصل اسلام کو (خدانخواستہ) مٹانے کی منظم کوششیں ہیں۔ یہ پہلو ڈاکٹر پرل کے لیے ایک انکشاف تھا' انہوں نے مکالمے کے دوران کہا کہ ''میں تو یہ بات جانتا ہوں کہ مسلمان بجا طور پر خود کو محصور سمجھتے ہیں۔'' ڈاکٹر پرل کے نزدیک کم از کم یہ بات اہم تھی کہ ڈاکٹر احمد جانتے ہیں کہ یہودی واقعی خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''اسرائیل میں ہم نابود ہونے کے مسلسل خطرے سے دوچار رہتے ہیں۔'' لیکن پہلے انہوں نے کبھی کسی مسلمانوں کو اس کا اعتراف کرتے نہیں سنا تھا' کتاب پڑھ کر بالآخر انہوں نے پروفیسر اکبر احمد سے رابطے کا فیصلہ کیا۔

ولیم اینڈ میری کالج میں مکالمے کے سلسلے کی تیسری کڑی میں معاصر مکالمے کی اہمیت ابھر کر سامنے آئی۔ مباحثہ کا آغاز مسلمانوں اور یہودیوں کی مشترکہ تاریخ سے ہوا۔ ڈاکٹر احمد نے کہا ''مشرق وسطیٰ میں دو ابراہیمی مذاہب ہیں' تورات مقدس اور قرآن کریم کی بعض آیات نہایت مماثل ہیں۔'' تاہم اس مکالمے کا محور نظریاتی ایشوز یا متعدد روایات کی اصلیت تسلیم کرنا نہیں تھا بلکہ اس کا مرکز تشدد کے چکر کا خاتمہ کر کے جارحیت پر قابو پانا اور اگلی نسلوں کو امن کا ورثہ منتقل کرنے کے حامی لوگوں کے لیے فریم ورک تیار کرنا تھا۔

ان مباحثوں میں ہمیشہ اتفاق رائے ہی سامنے نہیں آیا' نہ ہی دونوں نے کبھی مشکل مسائل کو چھیڑنے میں جھجک محسوس کی۔ مثال کے طور پر عراق کی جنگ......ڈاکٹر احمد اس کا الزام 11 ستمبر کے

حملوں کے بعد پیدا ہونے والے جذباتی اور متلون ردعمل پر لگاتے ہیں' دوسری طرف ڈاکٹر پرل کے نزدیک امریکہ کے پاس ان حملوں کا تشدد کے سوا کوئی اور جواب دینے کی چوائس نہیں تھی جبکہ امریکہ حملے کرنے پر مجبور تھا۔ ڈاکٹر احمد ردعمل کی نوعیت پر معترض تھے اور اسے مثبت دیکھنے کے خواہاں تھے۔ وہ کہتے ہیں ''ہر مرتبہ بم پھینک کر آپ اسامہ بن لادن کی مدد کرتے ہیں' تاہم دونوں ڈاکٹر پرل اور ڈاکٹر احمد کا اس بات پر اتفاق کہ مسلمانوں کو نفرت اور تشدد جڑ سے ختم کرنے کے لیے تعلیم حاصل کرنا ہوگی۔ ڈاکٹر جوڈیا پرل نے کہا کہ ''ہمیں مسلمانوں کو دوسرا رخ دیکھنے میں مدد کرنے کی ضرورت ہے۔'' ڈاکٹر احمد نے اس سے بھی اتفاق کیا اور کہا کہ میڈیا کو بھی تعاون کرنا چاہیے' ایجوکیٹر اور امیج میکر کے طور پر میڈیا کو اپنی ذمہ داریاں سمجھنا ہوں گی۔ میڈیا کو محض نیوز کاسٹر کی حیثیت سے گھسے پٹے منفی متاثر کی رپورٹیں نہیں چلانی چاہئیں بلکہ مثبت رول ماڈل پر توجہ مرکوز کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر پرل نے ایسا ہی ایک مثبت قدم اٹھایا ہے'انہوں نے کہا کہ انہیں حال ہی میں ایک تنظیم ''ورلڈ ٹالرنس فنڈ'' سے خط موصول ہوا ہے'جس میں ایک تصویر بھی شامل تھی جس میں دکھایا گیا تھا کہ پاکستانی آنجہانی ڈینیل پرل کی یاد میں شمعیں روشن کر رہے تھے' ڈاکٹر پرل نے بتایا کہ ''میرے بیٹے کی تصویر کے اوپر لکھا تھا' ''مکالمے' مباحثے اور بحث کے ذریعے امن' ' اس تاثر کہ دہشت گرد اسلام کی نمائندگی کرتے ہیں کے برعکس ڈاکٹر اکبر ایس احمد کا مؤقف ہے کہ یہ بچے موحد مذاہب کی مشترکہ اقدار یعنی انسانیت کے احترام سے متاثر ہو کر شمعیں جلا رہے تھے۔ یہودیوں' عیسائیوں اور مسلمانوں کی الہامی کتب یہ درس دیتی ہیں کہ کسی انسان کی جان لینا ایسا ہے گویا پوری انسانیت کا قتل کر دیا جائے اور ایک انسان کی زندگی بچانا تمام انسانوں کو بچانے کے مترادف ہے۔ بچے جو کچھ کر رہے تھے وہ دراصل دہشت گردوں کی اقدار کے خلاف اسلامی بغاوت تھی۔

ڈاکٹر احمد اور ڈاکٹر پرل کے درمیان مکالمہ جات آج کے دور کی انتہائی مثبت پیشرفت میں شمار ہو سکتے ہیں' دکھ و صدمے کی کیفیت میں اس نفرت کو جڑ سے اکھاڑنے' جس نے ان کے بیٹے کی جان لی کے لیے ڈاکٹر جوڈیا پرل تشدد کے چکر کو توڑنے میں مدد دے رہے ہیں' اور پاکستانی بچوں کی

طرح ڈاکٹر احمد امن کے لیے ان کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام رہے ہیں اور یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ مختلف گروہوں کے درمیان کشمکش کا مذہبی یا قومی شناخت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

زیادہ گہرے تنازعات ان لوگوں کے درمیان ہیں جو انسانی وقار اور قانون کی حکمرانی کا احترام کرتے ہیں اور ان میں ان اقدار کی خلاف ورزی کا سامنا کرنے کی جرأت ہے، جن کا ارتکاب ان کی اپنی کمیونٹی کے ارکان کر رہے ہیں اور وہ جوان کے قبیلے کے لوگ نہیں ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ بعض حلقوں نے ڈاکٹر احمد اور ڈاکٹر پرل کے معرکۃ الارا مباحثوں پر منفی ردعمل ظاہر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں آخر ڈینیل پرل کی موت میں کیا خاص بات ہے؟ کیونکہ ہر روز مغربی کنارے، غزہ، اعراف اور افغانستان میں نہ جانے کتنے لوگ مرتے ہیں، لیکن کسی کو اس کی پروا نہیں ہوتی، اگر ان ہلاکتوں کے جواب میں ڈینیل پرل کو مار ڈالا جاتا ہے تو کیا ہوا؟ ڈاکٹر پرل اور ڈاکٹر احمد نے انتقام کی اس قدیم تشریح کو مسترد کر دیا۔ آنکھ کے بدلے آنکھ کا قانونِ تورات کے مطابق حمورابی کے دور میں تو قابل قبول ہوسکتا ہے۔ (قرآن اور انجیل بھی اسے دہراتے ہیں) لیکن جدید دور میں ایسا کرنا ممکن نہیں، یہ دونوں سکالر انصاف پر زور دیتے ہیں، لیکن یہ انصاف اس قسم کے نقصان کا حامل نہیں ہونا چاہیے جو ڈینیل پرل کے خاندان کو اٹھانا پڑا ہے۔ ڈاکٹر پرل اور ڈاکٹر احمد صاحب بصیرت اور باشعور طبقے کی نمائندگی کر رہے ہیں، جو مذہبی، لسانی شناخت سے بالاتر ہو کر مشترکہ اقدار کی بنیاد پر مل کر کام کر رہے ہیں ان کے مخالفین کسی ایک مذہب، قومیت یا لسانی شناخت کے ارکان نہیں بلکہ نفرت اور انتقام کے نمائندہ ہیں۔

مکالمے کی طاقت میں توسیع کرتے ہوئے

احمد پرل مکالمہ جات اس نوعیت کی واحد مثال نہیں، صرف فلسطین و اسرائیل کے تنازعے کے حل کے لیے متعدد اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر 1993ء میں تنظیم Seeds of peace کا قیام عمل میں لایا گیا جس کا مقصد یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمان بچوں کو گرمیوں کی چھٹیوں میں مل بیٹھنے کا موقع فراہم کرنا اور مکالمہ طرازی ہوتا ہے، اپنی امیدوں اور تشویش کو بانٹ کر

شرکاء مخالف بننے کی بجائے مل کر کام کرنے کا گُن سیکھتے ہیں۔ یہ پراجیکٹ اتنا کامیاب ہے کہ اس کا دائرہ کار مزید وسیع کیا جا رہا ہے' اب یہاں تنازعات کے حامل کئی دیگر خطوں کے بچوں کو بھی لایا جا رہا ہے تا کہ مکالمے کے ذریعے حل پر غور کیا جا سکے۔ اسرائیلی گاؤں ''امن کا نخلستان'' "Neve shalom" عبرانی اور راحت السلام عربی میں 25 سال قبل بنایا گیا تھا تا کہ مندرجہ بالا مقصد کے حصول کے لیے یہودی' مسلمان اور عیسائی خاندانوں کو قریب لایا جا سکے۔

ڈاکٹر پرل ایمی بہل کے والدین کے کردار سے بھی متاثر ہیں' ایمی بہل سٹینفور یونیورسٹی کی گریجوایٹ سٹوڈنٹ تھی جو جنوبی افریقہ میں نسل پرستی کے خلاف جدوجہد سے متاثرہ افراد کی بحالی کے لے مصروف عمل رہی اور اسی کام کے دوران اسے قتل کر دیا گیا' اب اس کے والدین کے پاس ایک ہی چوائس تھی۔ یا تو اپنی بیٹی کے نظریات اس کے ساتھ دفن کر دیتے یا پھر اس جدوجہد کو آگے بڑھاتے' انہوں نے اپنا کاروبار فروخت کیا اور جنوبی افریقہ منتقل ہو گئے' جہاں انہوں نے ایمی بہل فاؤنڈیشن قائم کی اور انہی پسے ہوئے طبقوں کی امداد کا کام شروع کیا جن کی مدد کرتے ہوئے ان کی بیٹی زندگی سے محروم کر دی گئی تھی' جیسا کہ اس کے والد نے کہا ''مصالحت کی سب سے اہم گاڑی دیانتدارانہ مکالمہ ہے......

ہم یہاں اس لیے آئے ہیں کہ اس انسانی زندگی کو یاد کریں جو مکالمے کا موقع ملے بغیر چھین لی گئی' ڈاکٹر پرل کے پاس بھی یہی چوائس تھی' انہوں نے کہا کہ ''میرا بیٹا ڈینیل پرل ایک مذاکرات کار تھا' وہ کمیونیکیشن اور تعلیم کے ذریعے ذہن وقلب بدلنے کا غیر متزلزل جذبہ رکھتا تھا۔ پرل فیملی نے اپنے کام کو آگے بڑھانے کے لیے ڈینیل پرل فاؤنڈیشن قائم کی' جو اب اپنا دائرہ کار عالمی سطح تک بڑھا چکی ہے' چونکہ ڈینیل پرل وائلن نواز تھا' اس لیے اس کے والدین موسیقی کو بھی ایک ذریعے کے طور پر استعمال کر رہے ہیں' یہ فاؤنڈیشن اس مکتبہ فکر کے لوگوں میں مکالمے کی روح بیدار کرنا چاہتی ہے جو مذہب اور قومیت سے قطع نظر زندگی سے متعلق شائستگی کا عنصر نہیں رکھتے۔

ایسے طویل المدت اقدامات کے نتائج کی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی' تنازعات کے حل کی کوششوں کی راہ میں عشروں کا بوجھ اور صدیوں کی روایات کی رکاوٹیں حائل ہیں' نہ ہی مکالمہ پرتشدد

انتقام کے مقابلے میں فوری مؤثر ثابت ہوسکتا ہے۔ ولیم اینڈ میری کالج میں مباحثوں کے دوران طلباء کا رویہ حوصلہ افزاء تھا' چاہے وہ یہودی' عیسائی یا مسلمان تھے رسپانس امید سے بھرپور تھا' وہ سب مشرق وسطیٰ میں جاری تشدد کے چکر کو توڑنے کے خواہاں تھے' البتہ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ یہ احساس امید انتہائی ذمہ داریوں کے محسوسات کے ساتھ جڑا ہوا ہے' یہ جانتے ہوئے کہ بہرحال ایک حل موجود ہے' انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اسے نظرانداز نہیں کرسکتے' ان کا اس بات پر اتفاق تھا کہ یہ چیلنج پُرخطر ہے' ایک طالب علم کا کہنا تھا کہ عسکریت پسندوں کے چہروں پر ناکامی کی مایوسی کا ماسک چڑھا ہوا ہے' معصوم افراد پر حملوں کے لیے جانیں دینے والے روحانی طور پر پہلے ہی مردہ ہیں۔

اپنے مکالمے کو عوامی سطح پر نمایاں کرکے ڈاکٹر احمد اور ڈاکٹر پرل نے درحقیقت خاموش اکثریت کو آواز دی ہے' انہوں نے دوسرے لوگوں کو بتایا کہ نفرت اور تشدد کو مسترد کرنے میں وہ تنہا نہیں اور پرامن طریقے سے دیگر عقائد کے لوگوں کے ساتھ مل کر تنازعات حل کرسکتے ہیں' یہی مکالمے کی طاقت ہے۔

باب20

تصادم، اخلاقیات، نشاۃ ثانیہ اور مکالمہ

جوڈیا پرل

صدر جارج ڈبلیو بش نے 15 اپریل 2004ء کو اپنی تقریر میں میرے بیٹے ڈینیل پرل کے قتل کو عالمگیر ''نظریۂ قتل'' کا شاخسانہ قرار دیا، انہوں نے کہا کہ ''بغداد میں لوگوں کو یرغمال بنانے اور سڑک کنارے بم نصب کرنے والے دہشت گرد بھی اسی نظریے پر عمل پیرا ہیں جس کے تحت میڈرڈ میں ٹرین حملوں میں معصوم افراد کو ہلاک کیا گیا، یروشلم میں بس سوار بچوں کو قتل کیا گیا، بالی میں نائٹ کلب کو دھماکوں سے اڑا دیا گیا اور (کراچی میں) ایک اخباری رپورٹر (ڈینیل پرل) کا گلا محض اس لیے کاٹ ڈالا گیا کیونکہ وہ یہودی تھا۔

ایک ہفتے بعد ولیمز برگ، ورجینیا، میں یہودی مسلم مکالمے کے دوران رپورٹروں کا مجھ سے پہلا سوال یہ تھا کہ ''صدر بش کے آپ کے بیٹے کے بارے میں تاثرات پر آپ کا ردعمل کیا ہے؟'' میرا جواب تھا: ''میں صدر کے اس مشاہدے سے اتفاق کرتا ہوں۔ ڈینیل کا سانحہ جنونیت کی موجودہ لہر کو سمجھنے کے لیے اہم ہے، تاہم میں ڈینی کے ورثے کو مشرق ومغرب کے درمیان مکالمے کے ازسرنو آغاز اور دونوں کے درمیان پل بنانے کے ذریعے کے طور پر لیتا ہوں۔ یہی وہ کوشش ہے جس میں ان دنوں اپنی زیادہ تر توانائی صرف کر رہا ہوں۔

صدر بش حق بجانب تھے، تشدد کی جو لہر اس وقت زمین کو ہلا رہی ہے وہ اپنی ہیئت کے اعتبار سے ایسی ہے جس کا دنیا کو پہلے کبھی سامنا نہیں ہوا، تاریخ میں پہلی بار دوستانہ پیغام رسانوں کو لاکھوں تماشائیوں کے روبرو منظم طریقے سے ہلاک کیا گیا، تاکہ ان لوگوں کو پیغام پہنچ سکے جن کو یہ لوگ دشمن سمجھتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ دنیا ظلم و جبر سے پہلے بھی آشنا تھی اور شاید اب سے بڑے پیمانے پر آگاہ تھی' لیکن نازی بھی اپنے شرمناک قتل کو چھپانے کی کوشش کرتے تھے' لیکن پھر بھی خوف' شک اور ندامت کے تاثرات سامنے آئے' دوسری طرف ڈینیل کے قاتلوں نے اس کے برعکس تکلیف دہ انداز میں کھلے عام اپنی جنونیت کا مظاہرہ کیا' انہوں نے قطعی طور پر عقیدے' نیکوکاری اور فاتحانہ انداز کی بناء پر یہ کام کیا اور الٹا تماشائیوں سے ہمدردی کے طلبگار تھے اور اس سے بھی تکلیف دہ بات یہ ہے کہ کچھ تماشائیوں نے ان سے ہمدردی کا اظہار کیا بھی تھا (سعودی عرب اور پاکستان سے ملنے والی رپورٹوں کے مطابق) اور جیسا کہ 2004ء میں نکولس برگ اور فیبر زیو کوٹرچی کے قتل سے اشارہ ملا کہ دیگر لوگوں کو پیغام پہنچانے کے لیے قتل و غارت کا ذریعے دنیا کے مخصوص علاقوں میں کافی قابل قبول ہے۔

انسانی جان کی حرمت پر ایسے بے رحم حملے انسانی تہذیب کے ارتقاء کے عمل میں ایک بڑی رکاوٹ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہمیں خود سے یہ سوال کرنا ہوگا کہ اس رکاوٹ کا منبع کہاں ہے اور کیا اسے سمجھایا' کنٹرول یا الگ تھلگ کیا جاسکتا ہے۔

میرا یہ یقین ہے کہ موجودہ عالمی تنازعہ دو گروہوں میں تصادم کی عکاسی کرتا ہے' ایک وہ لوگ ہیں جو دیگر طبقوں کے نقطہ ہائے نظر اور کتابی اختلافات کی قدر کرتے ہیں دوسرا وہ گروہ ہے جو اس کے متضاد ہے' میرے ذہن میں یہی بات تھی جب میں نے لکھا کہ: ''ہمیں لوگوں کو ایک نئے محاذ پر متحد کرنا ہوگا' جہاں قومیت یا مذہب کی جگہ شائستگی اور مفاہمت کو ترجیح دی جائے۔(1)

لیکن جن گروہوں کا ذکر میں نے پیچھے کیا ' کے بارے میں رائے ناقابل علاج تضاد پر مبنی ہے اور اسے اخلاقیاتی مشاہدے کی واحد اساس کے طور پر نہیں لیا جاسکتا۔ یہ تضادات اس منطقی فلسفے کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس کے بارے میں برٹرینڈ رسل نے 1903ء میں تحقیق کی تھی اور جو خودحوالگی کرائیٹیر یا سے منسلک ہے۔(2) اس شخص کے بارے میں تصور کریں جو خود کو شامل معاملہ (Inclusivist) قرار دیتا ہے۔ فطری سی بات ہے کہ یہ شخص خود کو Inclusive کیمپ کا حصہ سمجھتا ہے اور مخالف گروہ Exclusivists سے خود کو مختلف سمجھتا ہے' لیکن یہ موقف دراصل خارجی گروہ کا ہے اور بالآخر اسے اسی گروہ میں لا کھڑا کرتا ہے۔

رسل کے نظریے کو محض منطق قرار دے کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا' اس کی قوت نے مجھے اس وقت متوجہ کیا جب میں ایک پاکستانی دوست سے بحث کر رہا تھا اور اس دوست کا کہنا تھا کہ وہ صدر بش جیسے لوگوں کے ساتھ کھڑا نہیں ہو سکتا جو ''ہم بمقابلہ وہ'' کا رویہ اختیار کرتے ہیں۔

میں نے اپنے دوست کو نشاندہی کی کہ ''ہم بمقابلہ وہ'' کیمپ سے الگ کر کے وہ دراصل اسی گروہ میں شامل ہو رہا ہے جس سے اسے اختلاف ہے۔ رسل کے فلسفے کا سبق یہ ہے کہ کوئی خود کو قطعی لاتعلق نہیں رکھ سکتا' حتیٰ کہ انتہائی برداشت والے شخص کو ان مخصوص نظریات کو مسترد کر دینا چاہیے لیکن اس عمل میں اسے برداشت' اجتماعیت اور Inclusivity جیسی اعلیٰ اخلاقی بنیادوں کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔ قابل مسترد نظریات کی مثالوں میں وہ لوگ شامل ہیں جو مختلف تقاضوں اور عقائد کے مابین عدم رواداری کی وکالت کرتے ہیں اور وہ جو انسانیت کی بقاء کے لیے خطرہ ہیں اور وہ لوگ مہذب معاشرے کی بنیادی اقدار کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

یہ فلسفہ اطلاقی اخلاقیات کے نظریات کے خلاف ایک مؤثر دلیل پیش کرتا ہے' جس کے مطابق غلط یا صحیح' نیکی یا بدی دیکھنے والی کی آنکھ میں ہوتی ہے۔ ایک دہشت گرد دوسرے کی نظر میں حریت پسند ہوتا ہے' کسی کے نزدیک کوئی قابض ہے تو دوسرا اسے حریت پسند سمجھتا ہے اور یوں سلسلہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس قسم کے فلسفے کے نتیجے میں اسامہ بن لادن کے نظریے کو جواز ملا جو پھر ہر طرف اخلاقی دیوالیہ پن کی طرف گامزن ہو گیا۔

یہ تسلسل مہذب معاشرے کی غلط یا صحیح معروضی اقدار کے حوالے کے ذریعے توڑنا چاہیے' معصوم افراد کی مشکلات کم کرنے میں مصروف عمل افراد کو اخلاقی طور پر ان لوگوں کے برابر نہیں قرار دیا جا سکتا جو لوگوں کی مشکلات میں اضافے کا باعث بنتے ہیں اور اس میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

یہ داخلی یا خارجی امتیاز نہیں بلکہ بنیادی اقدار پر انحصار تھا جو نائن الیون کے حملوں کے منصوبوں اور ڈینیل پرل کے قاتلوں اور ابوغریب جیل میں ظلم و ستم کرنے والوں کی تحریک کا باعث بنا یہی معاملہ نظریاتی تصادم اور اخلاقی ابہام کا شکار دنیا کا ہے۔

ہمیں اب خود سے یہ سوال کرنا ہوگا کہ کون سی چیز پیغام پہنچانے کے لیے دوسرے لوگوں کا سرقلم کرنے والوں اور اس کی مخالفت کرنے والوں میں تقسیم کا باعث بنتی ہے۔ کیا تقسیم کی یہ لکیر ثقافتی، مذہبی، نظریاتی ہے یا سیاسی؟

سیموئل ہنٹنگٹن نے تقسیم کی ان لکیروں کو تہذیبوں بالخصوص مسلمانوں اور مغرب میں تہذیبوں کے تصادم کے نظریے کے طور پر پیش کیا تھا۔ یہ آج کے دانشور طبقے میں زیادہ مقبول نظریہ نہیں کیونکہ یہ دنیا کی دو بڑی آبادیوں کے درمیان کشمکش اور دہشت آدمی کو مذہب یا شناخت سے جوڑنے کی بنیاد پر استوار ہے، یہ تعلق کم ازکم مغربی معیارات سے بالکل میل نہیں کھاتا۔

دوسری طرف پاکستان کے صدر پرویز مشرف نے ایک اور متبادل تھیوری کو فروغ دیا، وہی جو مغرب میں اکثر مسلمان ترجمان بیان کرتے رہتے ہیں۔

''ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ انتہاپسندی اور عسکریت پسندی کی جڑیں سیاسی ناانصافی، نظرانداز کرنے اور محرومی سے منسلک ہیں، کسی قوم یا طبقے میں سیاسی ناانصافی جب غربت اور جہالت سے مل جاتی ہے تو یہ ادغام دھماکہ خیز ہوتا ہے، جس سے شدید قسم کی مایوسی اور بے اختیاری کا احساس ہوتا ہے، وہ قوم جوان مہلک بیماریوں کا شکار ہوتی ہے، وہاں عسکریت پسندی اور دہشت گردی یا انتہاپسندی کے پراپیگنڈے کے امکانات کافی روشن ہوجاتے ہیں۔''(3)

اگرچہ صدر مشرف نے یہاں مذہبی بنیاد کا واضح ذکر نہیں کیا لیکن جب وہ ''دھماکہ خیز ادغام'' کی بات کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں لازماً یہ پہلو موجود ہوگا، جب ایسا ہوتا ہے اور مذہب کے نام پر کوئی کام کیا جاتا ہے تو بعض مذہبی رہنما ان دھماکوں کو معاشرے میں اپنی حیثیت کے ساتھ تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ یوں ہنٹنگٹن کے نظریے اور معاشی واقتصادی یا سیاسی فیکٹر کو لگی آگ پر تیل پھینکنے کا بمشکل جواز سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ نقطہ ہائے نظر موجودہ تنازعے سے نمٹنے کے لیے چوائس کے ضمن میں مؤثر اثرات کے حامل ہیں۔

مشرف کی سٹرٹیجی جسے وہ ''نشاۃ ثانیہ'' اور ''روشن خیال اعتدال پسندی'' قرار دیتے ہیں، اس طرح سے ہے۔ پہلا مرحلہ یہ ہے کہ مسلم دنیا عسکریت پسندی اور انتہا پسندی کو مسترد کردے اور

اقتصادی ترقی کا راستہ اختیار کرے' دوسرا کام مغرب بالخصوص امریکہ سے منسلک ہے کہ وہ منصفانہ طریقے سے تمام سیاسی تنازعات کا حل تلاش کرے اور محرومی کا شکار اسلامی دنیا کی ترقی کے لیے معاشی' سماجی شعبے میں تعاون کرے۔''(4)

اس سٹریٹجی کے عمومی خاکے سے عدم اتفاق بہت مشکل ہوگا' اگرچہ اس کے لیے بھی دو وضاحتوں کی ضرورت ہے' اول یہ کہ یہودی قوم کے فرد کی حیثیت سے میں امید کرتا ہوں کہ اس روشن خیال دور میں انصاف کی مساوات میں غیر مسلمان بھی شامل ہوں گے' اس کے علاوہ تعلقات معمول پر لانے' حق خودارادیت' سفارتی طور پر تسلیم کرنے اور قبولیت کے عوامل بھی پیش نظر رہیں گے۔ دوم' اہم ترین یہ ہے کہ روشن خیال اعتدال پسندی کی طرف مراجعت کے دوران مسلمانوں کے روحانی رہنماؤں کا کردار نہایت واضح ہونا چاہیے۔

مذاہب' تہذیبیں اور قدیم عہد نامے ہمیں اخلاقی رویوں کی مکمل ترکیب فراہم نہیں کرتے' بلکہ وہ صرف ہمیں دانشورانہ وسائل یا عمارتوں کی اینٹیں فراہم کرتے ہیں جس سے ہم مخصوص حالات میں اپنے افعال کے ارتکاب کا طریقہ کار تعمیر کر سکتے ہیں' روحانی اور نظریاتی قیادت کا اولین کام ہمیں یہ رہنمائی فراہم کرنا ہے۔ کسی مخصوص صورتحال میں کون سی اینٹ استعمال کرنی ہے اور جو اینٹ غیر ضروری ہے اسے دور کر دیا جائے' ایک روشن خیال قیادت وہ ہوتی ہے جو ان عوامل کو انتہا پسندوں کے ہاتھ مذہب کو یرغمال بنانے کے لیے استعمال کرتی ہے' اور روشن خیالی کی بحالی کے لیے ایسی ہی قیادت کی ضرورت ہے۔ اگر ہم نظریاتی قیادت پر مسلمانوں اور مغربی دنیا کے درمیان موجودہ تنازعے کو سمجھنے کے لیے ایک رہنما اصول کی حیثیت سے توجہ مرکوز کریں تو پھر ثقافتی اور مذہبی جڑوں کے باوجود تنازعے کے حل میں مایوسی نہیں ہوگی' جیسا کہ ہنٹنگٹن کا نظریہ کہتا ہے' نظریاتی اختلافات کو نشاۃ ثانیہ اور مکالمے سے دور کیا جا سکتا ہے۔

مسلم دنیا میں ایسے رہنما جو نشاۃ ثانیہ کو حقیقت میں بدل سکتے ہیں وہ دراصل وہ لوگ ہیں جو نوجوان اور اہل ایمان افراد کے ذہن امید کی طرف پھیر سکتے ہیں۔ انٹلیکچوئل لیڈر جو امن و جدیدیت پر یقین رکھتے ہیں' علما' ائمہ' شیوخ اور ایسے ملا جو اقلیت کے ہاتھوں اسلام کے یرغمال بننے پر تشویش کا اظہار کرتے رہے ہوں' نوجوان کے ذہن جیتنے کے ضمن میں پہلا قدم انہی لیڈروں کو

اٹھانا ہوگا اور حقیقی اسلام اور جہادی اسلام میں تمیز سامنے لانا پڑے گی اور یہ سیاسی نہیں مذہبی الفاظ میں کرنا ہوگا۔

نکولس برگ کے ظالمانہ قتل کے ایک ہفتے بعد میں نے مسلمان رہنماؤں کے نام ایک کھلا خط لکھا:

''میری آپ سے استدعا ہے کہ آپ ان جرأت مند مسلمانوں کے ساتھ آواز ملائیں جنھوں نے سخت الفاظ میں نہ صرف نکولس برگ کی ہلاکت کی مذمت کی بلکہ معصوم انسانوں کو اپنے مصائب کا پیغام منتقل کرنے کے لیے ہلاک کرنے کی روایت کو بھی مسترد کر دیا......لہٰذا میں مسلمان علماء پر زور دیتا ہوں کہ وہ آسان سی مذہبی زبان میں اپنا ردِعمل ظاہر کریں اوران جرائم کو گناہ اور توہین قرار دیں اوراپنے ساتھی مسلمانوں کو باور کرائیں کہ نکولس برگ، فیسر یز یوکوٹر چی اور ڈینیل پرل کے قاتلوں کو اللہ خود سزا دے گا کیونکہ وہ فرماتا ہے:''اور ہم نے گناہگاروں کے لیے آگ تیار کر رکھی ہے۔'' (القرآن:16)(5)

مزید یہ کہ مسلمان علماء ایسے حملوں کی منصوبہ بندی کرنے والوں کے خلاف فتویٰ جاری کرکے اسلام کا تاثر مزید بہتر کر سکتے ہیں اور یوں اپنی کمیونٹی میں پائے جانے والے اندیشوں کا خاتمہ کرکے انہیں انصاف کے کٹہرے میں لا سکتے ہیں۔''

مشرف کی روشن خیال اعتدال پسندی کے فروغ کے لیے اسلامی اصطلاحات یعنی حرام، تکفیر اورفتویٰ استعمال کی جاسکتی ہیں، جیسا کہ شموئیل بارنے جون۔جولائی 2004ء کے ''فارن پالیسی'' آرٹیکل میں لکھا تھا:

''شیوخ اور علماء کی طرف سے جہاد کو فریضہ قرار دینے کے فتاویٰ نے بنیاد پرستی اور اس کی حمایت کے انفراسٹرکچر کی نہایت حوصلہ افزائی کی ہے۔دہشت گردی کی حمایت میں جاری کیے گئے فتوؤں کے مقابلے میں ایسے فتوے بہت کم ہیں جن میں یہ کہا گیا ہو کہ ایسا کرنے والے جنت میں نہیں جائیں گے۔''(6)

مجھے امید ہے کہ اسلام کی فراہم کردہ ان اصلاحات کو استعمال کرکے روحانی لیڈر اسلام کی سچی

تعلیمات کی حفاظت کر سکتے ہیں اور روشن خیال اعتدال پسندی کی منزل حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس خوش امیدی کی ایک وجہ مغرب میں قابل ذکر تعداد میں موجود مسلمانوں کا مؤقف ہے' جو مغرب سے خیالات اور ضروریات کی مشرق کو منتقلی میں معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ اگر چہ کئی مغربی مسلمان خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں اور انہیں مغرب کے عزائم اور اقدار پر اعتراض ہے لیکن انہوں نے مغربی آزادیوں سے پورا لطف اٹھایا ہے اور اپنے غیر مسلم ہمسائیوں اور دوستوں کے لیے اچھے خیالات رکھتے ہیں' یہ لوگ مغرب کے بہترین سفیر ثابت ہوسکتے ہیں۔''

اہم ترین یہ کہ مغربی مسلمان نائن الیون کے بعد اسلاموفوبیا کا انتہائی نشانہ بنے وہ خاموشی اور مہلک طرح سے اسلام کا تاثر خراب ہوتے دیکھتے رہے' لیکن یہ خاموشی توڑنے سے روشن خیال کا سلسلہ آگے بڑھے گا' مغرب کی مساجد سے ثقافتی نشاۃ ثانیہ کو بتدریج مشرق کی طرف پھیلایا جاسکتا ہے۔

میں مغرب کے مسلمانوں' یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان ایک قدرتی شراکت داری پروان چڑھتے دیکھ رہا ہوں اور یہ مذہبی راستوں سے ہوتی ہوئی جنوبی ایشیا مشرق وسطٰی اور دیگر مسلمان ممالک تک بڑھ رہی ہے' یہ ایک ایسی پارٹنرشپ بن رہی ہے جو تینوں بڑے مذاہب کے درمیان مکالمے میں اہم کردار ادا کرے گی' مغربی مسلمانوں کو یہ یقین دلایا جاسکتا ہے کہ یہودی اور عیسائی احترام اور سماجی قبولیت کی قانونی جدوجہد میں ان کے قابل اعتبار سپورٹر ہیں۔ دوسری طرف یہودی اور عیسائی کو یہ یقین کرنے کی ضرورت ہے کہ مغربی مسلمان دہشت گردی' جنونیت اور نفرت کے خلاف ان کے پارٹنر ہوں گے' یہ یقین دہانی صرف مکالمے کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہے۔

میرا بیٹا ڈینیل پرل ایک مکالمہ ساز تھا جسے مغرب اور مشرق دونوں طرف عزت ملی' وہ لوگوں کے اذہان وقلوب تبدیل کرنے کے لیے مکالمے کی طاقت پر غیر متزلزل یقین رکھتا تھا' اس کی روح اور میرے پوتوں کے صدقے ہمیں مکالمے کا عمل جاری رہتا دیکھنا چاہیے۔

نوٹس

1- آئی ایم جیوش ۔ جوڈیا پرل 2004ء
2- برٹرینڈ رسل، دی پرنسپل آف میتھمیٹکس 1903ء
3- واشنگٹن پوسٹ ۔ یکم جون 2004ء
4- Ibid
5- وال سٹریٹ جرنل 20 مئی 2004ء
6- شموئل بار: دی ری لیجئس سورس آف اسلامک ٹیررازم، پالیسی ریویو:2004ء



باب 21

منصفانہ جنگ کی روایت اور ثقافتی مکالمہ

جین بیتھک ایلشٹائن

پہلی نظر میں بلاشبہ یہ کہنا غیر مناسب ہوگا کہ صرف جنگ کی روایت ہی مختلف ثقافتوں کے درمیان مکالمے کی راہ ہموار کر سکتی ہے۔ یہ روایت ایک ایسا کلیہ پیش کرتی ہے جس سے یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ کیا جنگ کے لیے اختیار کیے جانے والے ذرائع بذات خود منصفانہ ہوتے ہیں۔ یقیناً ہم یہ سوچتے ہیں کہ جب شوٹنگ شروع ہو تو مکالمے کا عمل رک جاتا ہے لیکن یہ کم از کم کچھ معاملات تعمیر کرنے کا راستہ ہے تاہم یہ جلد بازی پر مبنی نتیجہ ہے۔ درحقیقت مکمل اور قطعی انصاف کے کسی تصور کو جنگ کی خواہش کے حوالے سے منصفانہ جنگ کی روایت یہ بتاتی ہے کہ جنگ میں شامل کوئی بھی فریق بے قصور نہیں اور یہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہم ایک ایسی دنیا میں رہ رہے ہیں جس میں ہمیں یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ ہم اس اخلاقی خود پسندی کے فلسفے پر عمل کریں کہ ''ہم ٹھیک ہیں اور وہ غلط ہیں'' اس طرح ہم اپنے افعال کے درست ہونے کا جواز فراہم کرتے ہیں۔ اس قسم کا انعکاس مستند ثقافتی مکالمے کا آغاز ہے' ''مستند'' سے مراد اسی قسم کا مکالمہ ہے جو ہمارے اختلافات کی وضاحت کرتا ہے اور ہماری مشترکہ اطوار کی تلاش میں مدد دیتا ہے۔

منصفانہ جنگ کے تمام مندرجات کو مختصر مضمون میں پوری طرح واضح نہیں کیا جا سکتا' البتہ اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اپنے دفاع اور معصوم لوگوں کو نقصان سے محفوظ کرنے کی حد تک طاقت کا استعمال کیا جا سکتا ہے...... تاہم معصوم افراد کی تعریف اپنی نہیں ہونی چاہیے' اعلان جنگ صرف قانونی اتھارٹی کی طرف سے ہونا چاہیے اور اس پر کسی کو بری الذمہ قرار دے کر عملدرآمد نہیں ہونا چاہیے۔ جنگ کے عمل میں دو بنیادی عناصر سامنے آتے ہیں' اول' امتیاز' وہ یہ کہ لڑاکا فوج کو لڑائی میں مخالف

لڑاکا فوجوں اور غیر لڑاکا اہداف میں تمیز کرنی چاہیے۔ دوم' تناسب وہ یہ کہ طاقت کا اتنا استعمال کیا جائے جس سے کسی مسئلے کا حل نکل سکتا ہو۔حتیٰ کہ ایک ایسا شخص جو منصفانہ جنگ کی روایت سے لاعلم ہو بھی دیکھ سکتا ہے کہ اس نوعیت کی جنگ کا اخلاقی پہلوؤں سے جائزہ مجموعی طور پر اس مقصد کے لیے ہوتا ہے جس سے جنگ اور اس کی تباہ کاریوں کے مواقع کو کم سے کم کیا جاسکتا ہے۔

لیکن اس سے بھی زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت ہے۔منصفانہ جنگ کی روایت زور دیتی ہے کہ ایک سیاسی ضابطہ دراصل ذمہ داری کا ضابطہ ہوتا ہے' یہ طریقہ سوچ میکاولی کے فلسفہ سے عملدر آمد اور حلفیہ ایکشن دونوں کو مسترد کرتا ہے' یہ ایکشن کسی قوم کو طاقت کے ذمہ دارانہ اور محدود استعمال کرنے کا راستہ دکھاتا ہے۔منصفانہ جنگ کی روایت ہم سے متقاضی ہوتی ہے کہ ہم اپنے ہی لوگوں کے لیے ٹھوس ذمہ داری کا مظاہرہ کریں اور دوسرے لوگوں کے لئے بھی ایسا کیا جائے کیونکہ دوسرے لوگ ہماری قوم میں سے تو نہیں ہوں گے لیکن ضرور تمند ضرور ہوں گے' ہمیں ان لوگوں کو بھی بچانا ہے جن کو دیگر افراد تباہ کرنے کے درپے ہیں' امریکہ کی طرف پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے......اور دنیا کو بھی......1994ء میں روانڈا میں ہوتو قبائل کی طرف سے مخالف تتسی قبائل کے قتل عام پر ہم دہشت ناک اور شرمسار ہوجاتے ہیں اور یقیناً یہ غیر انسانی اقدام کرنے والوں کو بھی شرم آنی چاہیے۔منصفانہ جنگ کی روایت ہمیں سبق سکھاتی ہے کہ انصاف پر مبنی فیصلوں کے لیے فوجوں کی تعیناتی سے انکار کرنے والے دراصل اتنے ہی برے ہیں جتنے کہ دیگر علاقوں پر بلاجواز حملے کرنے والے ہوتے ہیں۔

یہی دراصل اس روایت کے بنیادی اصول ہیں' یہ کسی ثقافتی مکالمے میں کتنے معاون ہوسکتے ہیں؟ تہذیبوں کے درمیان مکالمے میں یہ براہ راست کتنا کردار ادا کرسکتے ہیں' منصفانہ جنگ کی روایت ہماری اس عمل کی ستائش کرنے کی حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ لڑائی کے دوران حملہ آور لڑاکا فوج اور ان کی حریف فوج اخلاقی طور پر برابر ہوتے ہیں' دونوں ایک دوسرے کے مدمقابل ہوتے ہیں' مسلح ہوتے ہیں اور کئی ایک دوسرے کو ہلاک کر ڈالتے ہیں' میدان جنگ کی سخت اور تیار مساوات اکثر فوجیوں پر گہرا اثر ڈالتی ہے' وہ خود کو تجریدی اور نامعلوم دشمن کے بارے میں سوچنے سے معذور پاتے ہیں' انہیں پتہ چلتا ہے کہ ان کے مدمقابل دشمن فوجی بھی امیدوں اور خوابوں کے

حامل انسان ہیں' وہ انسان جن کی زندگی اپنے لیے اور دوسروں کے لیے قیمتی ہے' فوجیوں کو پتہ چلتا ہے کہ کئی دشمن فوجیوں کے بچے ہیں اور اگر فوجی مرتا ہے تو بچے یتیم ہوجائیں گے۔ امریکی فوج میں خواتین کی موجودگی سے قطع نظر یہ بات واضح ہے کہ اس کا جن فوجوں سے سامنا ہوتا ہے ان میں مردوں کی بھاری اکثریت ہوتی ہیں اس آبزرویشن کو سمجھنے کے لیے عراق جنگ میں مرنے والوں کی فہرستیں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ تمام اخلاقی ادراک کی مختلف شکلوں کو جاننے کے حقائق ہیں جو طویل المیعاد طور پر نفرت اور دشمن کی شدت کم کرسکتے ہیں۔

میدان جنگ کی اقسام سے آگاہی ہمیں یاد دلاتی ہے کہ منصفانہ جنگ کی روایت یہ ہے کہ ہر قوم اور تمام لوگ ثقافتوں اور روایات کی پیچیدہ شکل ہیں۔ حتیٰ کہ جب ہم اپنی روایت سے وفادار ہوتے ہیں تو دوسرے بھی اپنی روایات سے جڑے ہوتے ہیں' ایسے خوفناک لمحات بھی ہوتے ہیں جب ایک سیاسی تحریک یا حکومت اپنی ہی قوم کی شناخت سے برباد ہوجاتی ہے۔ اس حوالے سے نازی جرمنی' سٹالن کے سوویت یونین' اور صدام حکومت کے واقعات ذہن میں آتے ہیں' ایسے واقعات میں ہم جانتے ہیں کہ اگر ہم لڑائی کررہے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم تمام ثقافتوں اور لوگوں سے لڑ رہے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کسی قوم پر قابض کی حیثیت سے غلبہ حاصل کیا انہوں نے اپنے مقاصد کے لیے ان کی روایات کو بھی تباہ کیا' اسی طرح جیسا کہ صدر بش اصرار کرتے ہیں کہ نائن الیون کی دہشت ناکیوں کے بعد پہلے لمحے میں امریکہ اسلام کی عظیم روایت کے خلاف نہیں بلکہ ان کے خلاف لڑے گا جو اس روایت کو بدنام کررہے ہیں اور اپنے مقصد کو جائز قرار دینے کے لیے ہزاروں معصوم افراد کو مار ڈالتے ہیں' تب پھر تہذیبوں کے مابین کوئی تصادم اس طرح نہیں جس طرح بعض لوگ اس تصادم کی خواہش کرتے ہیں اور تصادم کے طلبگار ہوتے ہیں اور اس طرح کام کرتے ہیں جس سے دیگر امکانات محدود ہوجاتے ہیں' اسامہ بن لادن نے اپنے کئی فتوؤں میں مسلمانوں سے کہا کہ وہ تمام امریکیوں کو ہلاک کردیں' جہاں بھی وہ نظر آئیں' یہ ایک قسم کی اخلاقی جنونیت ہے جس سے منصفانہ جنگ کی روایت روکتی ہے۔ اسامہ کے جنگی فلسفے میں کوئی فریق دوسرے فریق کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا اس میں صرف تباہ کردیا تباہ ہوجاؤ کا پہلو نظر آتا ہے۔

تاہم منصفانہ جنگ کی روایت ہمیں مختلف سمت دکھاتی ہے۔ یہ ہمیں یاد دلاتی ہے کہ کوئی قوم مہمات، دانش، انصاف اور شائستگی پر اجارہ داری نہیں رکھتی، یہ ہمیں یاد دلاتی ہے کہ نیک مقصد کے حامل افراد بھی برائی کی راہ اختیار کر سکتے ہیں۔ یہ بھی یاد دلاتی ہے کہ نازی جرمنی کی طرح بدی کے مقصد کے لئے لڑنے والے بھی ایسے آبرومندانہ طریقے سے لڑتے ہیں جو جنگی قوانین کے تابع ہوتے ہیں۔ منصفانہ جنگ کی تعلیمات میں دوسرے فریق کی آواز توانا ہوجاتی ہے اور وہ اپنے قسم کے جواز کی عقلی دلیل پیش کرتا ہے اس طرح ہم اپنے ہی افعال اور عزائم تک رسانی کے قابل ہوتے ہیں، یوں مصالحت کی گنجائش باقی رہتی ہے، انتہا پسندی کی مزاحمت کرتے ہوئے، منصفانہ جنگ باہمی مفاہمت کی پرورش کرتی ہے اور اس تاثر کو مسترد کر دیتی ہے کہ ''ہماری'' کوئی قدر ''ان'' سے مشترک نہیں۔ ہمیں حالت جنگ میں بھی امن کی ضرورت برقرار رکھنی چاہیے۔

باب22

کرۂ ارض کے پگھلتے برتن میں اختلافات کا جشن

شہزادہ حسن بن طلال

عالمگیر عدم تحفظ کا احساس کم ہی پایا جاتا ہے اور اگر کبھی یہ تھا تو آج اس کی شدت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔کوفی عنان

(یواین ایسوسی ایشنز کے بارسلونا میں اجلاس کے لیے پیغام:
8-11 مئی2003ء)

جمال کفازر اپنی کتاب (1)
Between two worlds: The construction of the Ottoman state
میں لکھتے ہیں ''یہ ضروری نہیں کہ کسی کا جنم خاص لوگوں میں ہی ہوا وہ داخلیت اور خارجیت پر مبنی زبان کے اندر بھی افراد کا حصہ بن سکتا ہے۔'' اسلامی نقطہ نظر سے دنیا میں پیدا ہونے والا ہر انسان آزاد،معصوم اور ایک جیسا پیدا ہوا' قرآن کے نزدیک نہ صرف اختلاف سے درگزر کیا جائے اور اسے قبول کیا جائے بلکہ اسے تخلیق کی ایک وجہ بھی سمجھنا چاہیے۔انسانوں کے مابین تعلقات کے بارے میں قرآن فرماتا ہے''اے لوگو' ہم نے تمہیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کیا تاکہ ایک دوسرے کی پہچان کرسکو۔'' (14:13) (2)

اس طرح قرآن اجتماعی کتاب(3) ہے جو پہلے والی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے'اسلام تہذیبی یکجہتی کا اجتماعی وژن ہے'جس کا اظہار توحید کے ذریعے کیا گیا۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں ہم اللہ کے حکم کے تحت دیگر انسانوں کا احترام کرتے ہیں۔ یہی دراصل کامل ترین معنوں میں تہذیب ہے' اس کے باوجود آج کئی سکالر حضرات اسلام اور جمہوریت'اسلام اور انسانی حقوق کو متضاد قرار دیتے

ہیں۔(4) شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ''اسلامی'' چیزوں کو ان دنوں ''مقید'' چیزوں سے تعبیر کیا جاتا ہے' البتہ آپ جب کئی معاشروں میں احتساب اور حتیٰ کہ جمہوریت کو نیا تصور سمجھا جاتا ہے۔(5) وہاں اسلام میں یہ دنوں تصورات صدیوں پہلے موجود تھے اور اسی پر مکالمے کی بنیاد رکھی گئی۔

افسوس کا مقام ہے کہ آج اسلام کے انسانی تہذیب میں کردار کی ستائش اور فہم کی اپلیں کئی بہرے کانوں پر بے اثر رہتی ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ آج کے دور کے قدامت پرست کہتے ہیں کہ تہذیبوں کے مابین مکالمے کو دہشت گردی کے خلاف نئی جنگ کے تناظر میں شروع ہونا چاہیے۔ امریکہ کے وزیر دفاع پاول وولفووٹز کا اپنی(6) ایک حالیہ تقریر میں کافی اعتدال پسند لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا کہ ''ہمیں اسلامی دنیا میں کروڑوں ایسے اعتدال پسند اور روادار مسلمانوں سے بات کرنا ہوگی...... جو آزادی اور جمہوریت کے ثمرات سے بہرہ مند ہونا چاہتے ہیں اور آزادانہ طور پر اپنے معاملات چلانا چاہتے ہیں۔'' لیکن دوسری طرف وہ اگلی سانس میں قدامت پسند لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''دہشت گرد نہ صرف مغرب بلکہ اپنے مسلمان ساتھیوں کو بھی نشانہ بناتے ہیں۔'' اکثر عیسائیوں' یہودیوں' بودھوں' ہندوؤں اور سکھوں کی طرح مسلمانوں کی اکثریت بھی اس ایشو کو بجا طور پر ایسے ہی لیتی ہے' لندن کی ''میمنی فاؤنڈیشن'' کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر مسہری نک نیم ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ ''مذاہب کو تنہا نہیں کیا جاسکتا اور کمیونٹیوں کو باہمی رابطوں کی ضرورت ہے۔'' ' اسی طرح روشن خیالی کے عمل کو بھی مذاہب نظرانداز نہیں کرسکتے کیونکہ اس میں شہری آزادی اور مذہبی آزادی کے توانا عناصر موجود ہیں۔(7)

ہر وہ شخص جو روشن خیالی میں اسلامی تہذیب کے کردار کی روشن خیال تفہیم چاہتا ہے وہ 1377 میں ''دور جہالت'' میں لکھی گئی ابن خلدون کی کتاب ''مقدمہ'' پڑھے کیونکہ کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ اعتدال پسند اور روادار مسلمانوں کو تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دو' اس کتاب میں قانون کی حکمرانی اور آزاد منڈیوں کی معیشت کا بہترین تجزیہ کیا گیا ہے' یہی دو چیزیں آج کی اسلامی بنیاد پرستی کے متضاد ہیں' بلاشبہ چھ صدی بعد بھی ابن خلدون کے خیالات آپ کے قدامت پسندوں کی سوچ کے مقابلے میں نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ ابن خلدون کا فلسفہ تاریخ یہ کہتا ہے کہ تہذیب

اس وقت ابھرتی ہے جب یکجہتی ہوتی ہے'اس بات کو آج کی جدید دنیا میں تہذیبی یکجہتی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔(8)

شاید یہی فلسفہ ایرانی صدر محمد خاتمی کی سفارتی کوششوں کے پیچھے کارفرما ہے جس کے تحت وہ تہذیبوں کے درمیان مکالمے پر زور دیتے ہیں' او آئی سی کے اجلاس سے خطاب میں وہ اس کے لیے عقلی استدلال اور دانائی کو بنیاد قرار دیتے ہیں۔(9) بین الاقوامی بالخصوص سپر پاورز کے تعلقات کے اہتمام کے حوالے سے یہ ایک مؤثر آلہ ثابت ہوسکتا ہے۔(10) لیکن اگر مکالمہ تہذیبوں کے درمیان تصادم کا اثر زائل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو پھر انتقام پر مبنی فلسفے پر وسیع تر تناظر میں ازسرنو غور کرنے کی ضرورت ہے۔

تہذیبوں کے مکالمے کے اقدامات ظاہر کرتے ہیں کہ ''مذاہب محض نظریات کا مجموعہ نہیں'' (11) بلکہ ان کے اہم عملی پہلو ہیں۔ اسلام کے لیے بلند کی جانے والی جنگ دراصل عقیدے کے اتحاد کی صدا ہے'لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ مقصدیت اور آگاہی کے اتحاد کی بھی صدا ہے'اس کے لیے تہذیبی یکجہتی ہماری مشترکہ انسانیت کا تقاضا ہے۔''اور اس نے تم پر وہ مذہب نازل فرمایا جو اس نے حضرت نوحؑ پر اتارا تھا'اور جو ہم نے تم پر نازل کیا وہی ابراہیمؑ اور عیسیٰؑ پر نازل کیا' اپنے مذہب پر قائم رہو اور اپنی صفوں میں انتشار نہ آنے دو۔''(12)

لیکن تہذیبی یکجہتی کا تصور مشترکہ انسانیت کے مقبول عام تصور تک محدود نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے عصری چیلنجوں کے حل کے لیے منعقد کے گئے پالیسی ساز اجلاسوں میں روشن خیال ذاتی مفاد پر مبنی ہونا چاہیے۔ اس مقام پر پالیسیوں اور سیاست میں فرق ہے' بالخصوص مختلف کلچر کے حامل افراد کے درمیان تعلقات کار کے حوالے سے۔اطالوی سفارت کار رابرٹو ٹوسکانو یہ دلائل دیتے ہیں کہ اس ضمن میں بیشتر کردار اقلیتی قوموں کا ہے'ان کی توجہ کا محور خصوصی طور پر مغرب میں مقیم مسلمان اور ان کی صحیح نمائندے چننے کی صلاحیت ہے'اس کے ساتھ مسلمانوں کے حکام سے رابطے' اپنے مذاہب اور کلچر سے کامیاب وابستگی اور جمہوری روایات سے تال میل بھی ضروری ہے۔درحقیقت اطالوی سفارتکار یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تعصب کے بغیر لبرل نقطہ نظر بین الاقوامی

دہشت گردی جیسے بیرونی خطرے کے فیکٹروں کو مسترد کر دے گا' وہ وضاحت کرتے ہیں کہ ہم ایک ایسی صورتحال کی طرف بڑھیں گے جس میں امریکی کیتھولک کی طرح یورپی مسلمان کی اصطلاح رائج ہوگی' لیکن ایسا اس وقت تک ہرگز نہیں ہوسکتا جب تک مغرب یہودیت' عیسائیت اور اسلام کے ورثے کو تسلیم نہیں کر لیتا' اسلام جغرافیائی طور پر محدود مذہب نہیں' بلکہ یہ ایک ایسا عالمگیر پیغام ہے جس کے اندر متنوع ثقافتیں' بشمول امریکی و یورپی' سمائی ہوئی ہیں۔

لفظ Problematique اور مشترکہ انسانیت کو سمجھنا اخلاقات کی بنیاد ہے' اس وقت دنیا میں عالمگیر طور پر قابل قبول انسانی یکجہتی کے ضابطے کے فروغ کی ضرورت ہے۔ انسانی یکجہتی کے ضابطوں سے سامنا کرتے ہوئے ہمارا واسطہ تبدیلی کی قوتوں' بچوں' بے آسرا افراد' محروم طبقے' انسان کے پیدا کردہ بحرانوں اور صنعتی تباہ کاریوں سے پڑتا ہے' اس طرح ہمیں یہ اعتراف کرنے کا موقع ملتا ہے کہ مسائل کو تن تنہا حل نہیں کیا جاسکتا' نہ طویل المدت اثرات سے نظریں چرا کر قلیل المدت فوائد حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ ہماری بقا کا انحصار دیگر افراد کے افعال اور زندگیوں پر ہے' یہ انحصاریت بین الاقوامی استحکام پر مبنی معیشت اور گلوبل گورننس کے نظام کی متقاضی ہے' یہی انحصار ایک تہذیبوں کے مکالمے کے لیے ناگزیر ہے۔ اس انسانی یکجہتی کے ضابطے کے تحت انٹرنیشنل انسانی حقوق اور انسانیت سے متصادم عناصر کے تدارک کی ضرورت ہوگی' انسان کے انسان سے تنازعے' انسان اور قدرت میں ٹکراؤ' انسان کے پیدا کردہ بحرانوں کے قدرتی تباہ کاریوں سے ٹکراؤ کے تمام موضوعات اسی فلسفے کے گرد گھومتے ہیں' لیکن افسوس یہ ہے کہ اپنے تمام تکنیکی مالیاتی اور انسانی وسائل کے باوجود دنیا مسائل میں اسیر اور حل میں غریب تر ہوتی جارہی ہے۔

خارجی نظریے کے ساتھ اخلاقیاتی تبدیلی کیونکر ممکن ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ بعض بنیادی تصورات پر تہذیبوں کے درمیان مکالمے کے ذریعے از سر نو غور ہونا چاہیے۔ غربت اور عدم مساوات ہماری دشمن ہیں اور بلاشبہ ''غربت سے لڑائی دراصل جنگ سے جنگ ہے اور اس جنگ کو جیتنے کا واحد رستہ جنگ جیتنے کے روایتی تصور سے ہٹ کر دیرپا امن ڈھونڈنے میں ہے۔'' (14) لیکن کیا ہم

غربت کی ڈالروں اور سینٹ کے تناظر میں نئی تعریف کر سکتے ہیں؟ امام علیؑ ابن طالب کے نزدیک ''غربت' مذہب کو نقصان پہنچاتی ہے۔عقل کو دور کرتی ہے اور نفرت کی طرف لاتی ہے۔'' لہٰذا غربت کو مقامی اور بین الاقوامی پالیسی سازی میں خاص اہمیت حاصل ہونی چاہیے' شاید جنگ کی جگہ امن کے فروغ کا کلچر پروان چڑھانے کا وقت آ گیا ہے۔

نئی ہزاری میں ذمہ داری کے ایشوز نے نئی جہت اختیار کر لی ہے۔ بنی نوع انسان اب بھی ٹکراؤ' تشدد کے عناصر کے ساتھ چیلنجوں کا شکار ہے۔اس تناظر میں ''پارلیمنٹ آف کلچرز'' کی بنیاد رکھی گئی جو خطہ میں مذاکرات اور مکالمے کے لیے بین العلاقائی کوشش تھی۔ یہInter rgional تنازعات پر غور کے لیے مفید پلیٹ فارم اور ثقافتوں کے درمیان پل تعمیر کرنے کی عملی کوشش ہے۔اقدار' مقصد اور وژن کے مشترکہ اقدامات کو اختلافات سے قطع نظر بین الاقوامی پذیرائی ملتی رہے گی۔تہذیبوں کے تصادم کے عنصر کو ذہن سے نکالنا ہوگا' بحیثیت مسلمان میرا ایمان ہے کہ اسلام اخلاقیات اور اجتماعیت کا درس دیتا ہے اور عدم رواداری کی مذمت(15) کرتا ہے۔اس منطقی نتیجے تک پہنچنے کے بعد تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ سیاسی بنیاد پرستی اور نفسیاتی علیٰحدگی پسندوں کے نظریے سے زیادہ کچھ نہیں۔

ایسا اس وقت ممکن ہے جب ہم اپنی سوچ عالمی رکھنے کے ساتھ عملی طور پر علاقائی اقدامات کریں' اختلافات کا احترام کر کے ہم یہ مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔ تاریخ کا خاتمہ ہونے والا ہے یا نہیں' کوئی اہم نقطہ نہیں' جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایسے نظریات ہیں جن سے جنگ' دہشت' تشدد اور انسانیت کی تذلیل کا خاتمہ ممکن ہو۔

تہذیب کے پگھلتے واحد برتن پر حاوی خوف کے دور میں مشترکہ انسانیت کو کرہ ارض کے لیے تمام تہذیبوں کے کردار کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

نوٹس

1- The construction of the Ottoman state' جمال کفازر2002ء
2- قرآن کریم
3- ڈیوڈ زیدان کے مضمون مطبوعہ میریا جرنل۔ 2001ء
4- اسلام' لبرل ازم اور ہیومن رائٹس' کترینہ ڈیلاکورا۔2003ء
5- War and Accountability
6- پال وولفووٹز کا مقالہ۔ یکم جون2002ء
7- The lesson of September' مسہری تک نیم
8- ماہنامہ اٹلانٹک
9- صدر خاتمی کا خطاب
10- Schwarz and Layne / ہارڈ کوائچن
11- محمد لیجن ہاسن' اسلام اور مذہبی اجتماعیت
12- قرآن مجید
13- رابرٹو توسکانو کا مضمون
14- Eveline millenium
15- احمد ایچ الرحیم

حصہ چہارم

تشویش سے عمل کی طرف

باب23

ثقافتوں کا مکالمہ یا تصادم

برنارڈ لیوس

ایک لحاظ سے تہذیبوں کے درمیان تصادم کا عمل اس وقت سے جاری ہے جب سے دنیا کی تاریخ لکھنے کا آغاز ہوا۔ اس وقت مختلف کلچر ابھرے' پھلے پھولے اور پھر ان کا باہم ملاپ ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ اکثر اوقات ایسی ملاقاتوں میں جارحانہ رویہ اختیار کیا جاتا تھا اور مکالمے سے زیادہ تصادم کا تاثر ملتا' لیکن ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا تھا' یہاں تک کہ حالت جنگ میں بھی کئی تہذیبیں اشیائے خوردنی' مہارتوں' علوم اور خیالات کا تبادلہ جاری رکھتیں۔

اس قسم کے تبادلے کی بہترین مثال اسلام اور عیسائیت کے درمیان رابطہ تھا' شروع میں یہ تصویر زیادہ واضح نظر نہیں آتی......دونوں مذاہب کے درمیان جنگیں فتح' در فتح اور حملہ در حملہ پر مشتمل رہیں' یہ تاریخ میں طویل ترین کشمکش تھی اور بعض افراد کے نزدیک یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

لیکن سب لوگ اسے ایسا نہیں سمجھتے تھے اور ان افراد جو ٹکراؤ پر مکالے کو ترجیح دیتے ہیں کے لیے یہ صورتحال کافی حوصلہ افزا ہے' یہ ٹھیک ہے کہ اس وقت شدید اور طویل جدوجہد کی جاتی رہی لیکن اختلافات سے قطع نظر فریقین ایک دوسرے تعاون کرتے رہے......اگرچہ یہ کوئی قابل ذکر نہیں تھا' دونوں کے ماضی کا ورثہ ایک جیسا تھا' مشرق بحیرہ روم اور مشرق وسطیٰ کی تہذیبوں کا حامل' دونوں کائنات کی ہیئت پر ایک جیسا عقیدہ رکھتے تھے' دونوں کا اس حوالے سے نہ صرف ماضی میں اتفاق رہا بلکہ اب بھی ایسا ہو رہا ہے......وہی مشن کہ اس سچائی کو بنی نوع انسانی تک پہنچایا جائے۔

ماضی کے ٹکراؤ اور نوعیت کے باوجود اپنی ان مماثلتوں کے باعث ہم مکالمے کی امید کر سکتے ہیں۔ آج دونوں طرف ایسے عناصر موجود ہیں جو ایسا مکالمہ چاہتے ہیں۔ کچھ دیگر حتمی تصادم کی تیاری کر رہے ہیں' ہر فریق کو اپنا راستہ خود چننا ہے۔

باب24

مکالمے کی فیلوشپ

جیمز ڈی وولفن سوہن

سرد جنگ کے بعد لوگوں کو انتہائی متوجہ کرنے والے سیاسی نظریات میں سے ایک ''تہذیبوں کے مابین تصادم'' کا نظریہ تھا۔اس کے مطابق طویل عرصے سے برقرار نظریاتی دراڑیں جلد ایک نیا عالمگیر منظرنامہ تشکیل دیں گی جس کی جڑیں معاشی اور سیاسی نہیں بلکہ ثقافتی ہوں گی۔2001ء میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر دہشت گردی کے حملوں کے بعد یہ تھیوری ایک بار پھر زیر بحث آنے لگی جس کے باعث اسلام اور مغرب میں تصادم کے خدشات ایک بار پھر سر اٹھانے لگے۔

ثقافتی تصادم یا دنیا کی تقسیم کے حوالے سے ناگزیری سے میں اتفاق نہیں کرتا' یہ ٹھیک ہے کہ جس نسل سے میرا تعلق ہے وہ یہ سوچ کر جوان ہوئی کہ زمین پر دو دنیائیں ہیں' ایک وسائل کی حامل دوسری محروم' اور اکثر پہلوؤں سے یہ دونوں قطعی مختلف ہیں'لیکن یہ سوچ تب بھی غلط تھی اور آج تو بالکل غلط ہے۔ امیر ملکوں کو غریب ممالک سے الگ کرنے والی تصوراتی دیوار 11 ستمبر کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے ٹاوروں کے ساتھ ہی گر پڑی تھی۔

اپنی مشہور روداد ''اندھے شیشے میں سے دیکھنا'' میں سینٹ پال لکھتے ہیں:''جب میں بچہ تھا' تو میرا طرزِعمل بھی بچکانہ تھا' میری فہم بچوں جیسی تھی' میں بچوں کی طرح سوچتا تھا'لیکن جب میں جوان ہوا تو میں نے بچپنے کو خیرباد کہہ دیا'' اب ہم بہتر طور پر جانتے ہیں کہ ہماری دو نہیں ایک دنیا ہے اور ہمیں مستقبل کی طرف واضح انداز میں دیکھنا ہوگا۔

آج دنیا کی آبادی 6ارب نفوس پر مشتمل ہے اور ان میں سے ایک ارب افراد ترقی پذیر دنیا کے باسی ہیں۔ خیال ہے کہ کرّہ ارض کی آبادی میں جلد 2ارب افراد کا اضافہ ہوگا اور اس میں سے

5 کروڑ ترقی پذیر ممالک کے شہری ہوں گے۔ اس وقت دنیا کی نصف آبادی 25 سال سے کم عمر کے افراد پر مشتمل ہے' کئی لوگوں کو غربت' بیروزگاری کا سامنا ہے' جبکہ متعدد افراد عالمگیر نظام میں عدم مساوات سے مایوسی کا شکار ہیں۔ ایک بڑی تعداد میں لوگ روزگار کے لیے اپنے ملک چھوڑنے پر مجبور ہیں' مائیگریشن ایک اہم ایشو ہے اور تارکین وطن کی طرف سے رقوم کی ترسیل کا حجم اب ترقیاتی امداد سے بڑھ چکا ہے۔

ہم کئی واسطے سے باہم منسلک ہیں' یہ تعلق صرف تجارت' فنانس اور مائیگریشن کی نسبت سے نہیں بلکہ ماحولیات' بیماری' منشیات' جرائم' تصادم اور یہاں دہشت گردی کے حوالے سے بھی ہے۔ امیر ہو یا غریب' سب کی یہ خواہش مشترک ہے کہ ہم اپنے بچوں کو ایک بہتر دنیا دیں' ہمیں یہ اچھی طرح احساس ہے کہ ہم اگر دنیا کے کسی ایک حصے میں ناکام ہوتے ہیں تو دیگر حصوں کے افراد بھی اس سے متاثر ہوں گے۔

دوسرے ملکوں اور ثقافتوں کے بارے میں جاننا اور ان کی اقدار اور خواہشات کا احترام کرنا انتہائی ضروری ہے۔ آسٹریلیا میں پرورش پاتے ہوئے مجھے یورپ کے بادشاہوں کے بارے میں تو بہت کچھ پتہ چلا لیکن میں اپنے ایشیائی ہمسائیوں کی سنہری تاریخ سے لاعلم رہا' آج نوجوان اور بوڑھے افراد کو اسلام' ہندوستان' چین اور افریقہ کے بارے میں جاننے کی ضرورت ہے' ہمیں مزید متنوع اور ثقافتی جکڑ بندیوں سے آزاد دنیا میں رہنے کے لیے خود کو تیار کرنا ہوگا۔

اس مقصد کے حصول کے لئے مذہب کی حامل کمیونٹیوں کو خصوصی کردار ادا کرنا ہوگا' تنوع کے اندر اتحاد قائم کرنا اور مکالمے کی حوصلہ افزائی کرنا پڑے گی۔

مکالمے سے عمل کی طرف

2003ء میں میری پیرس میں 120 ملکوں سے آئی نوجوان قیادت سے ملاقات ہوئی' میں ستمبر 2004ء میں سرائیوو میں ایک بڑے گروپ سے ملا' ان اجتماعات میں ایڈز اور خانہ جنگی سے یتیم ہونے والے بچے' روما کمیونٹی اور معذور نوجوان شامل تھے اور مذاہب کی ایک بڑی تعداد کی نمائندگی بھی کرتے تھے۔

یہ لوگ امن اور باہمی احترام کے ماحول میں اکٹھے ہوئے' انہیں حیرت تھی کہ میری (مصنف

کی) نسل ایسا کیوں نہیں کر سکی تھی' انہوں نے کہا کہ وہ حل کا حصہ بننے کے لیے تیار نہیں ہیں اور پارٹنر بننا چاہیں گے' لیکن انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ ایسا مستقبل نہیں چاہتے جس کی بنیاد صرف معیشت پر استوار ہو بلکہ اس کے علاوہ بھی کچھ ہونا چاہیے' انہوں نے ہمیں اقدار اور عقائد کے حوالے سے چیلنج کیا۔

لہٰذا ہمیں ان نوجوانوں کے ساتھ اس چیلنج کو قبول کرنا ہوگا۔

حضرت محمد ﷺ نے فرمایا: ''خدا اس وقت تک کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود تبدیلی لانے کی کوشش نہیں کرتی۔''

ہم ایسے حالات میں خاموش تماشائی بنے نہیں رہ سکتے جبکہ دنیا میں ایک ارب افراد یومیہ ایک ڈالر آمدن پر گزر بسر کرنے پر مجبور ہوں' 30 لاکھ افراد ہر سال ایڈز سے مر جاتے ہوں' ان ہلاکتوں میں سے 20 لاکھ صرف افریقی خطے میں صحارا میں ہوتی ہوں' جب ایک کروڑ بچے سکول کا منہ تک نہ دیکھ سکتے ہوں' کئی خطوں میں کروڑوں افراد کو روزگار میسر نہ ہو' تمام مذاہب اور ثقافتوں کو امید کے لیے ڈٹ جانا چاہیے...... کیونکہ جہاں امید نہیں ہوتی وہاں تشدد آخری پناہ ہوتی ہے۔

حالیہ مہینوں کے دوران عراق' افغانستان اور مشرق وسطیٰ اخباری شہ سرخیوں میں سرفہرست رہے' لیکن ماضی کے درجنوں برسوں میں دنیا کے مختلف 44 مقامات پر 56 بڑے مسلح تنازعات ہوئے' دنیا کے 20 غریب ترین ممالک میں سے 80 فیصد کو اس دوران بڑی خانہ جنگی کا سامنا رہا۔ 1998ء سے صرف کانگو میں 30 لاکھ افراد خانہ جنگی سے موت کے منہ میں چلے گئے۔

ہمیں امیر اور غریب کے درمیان وسائل اور حقوق کے حوالے سے ان ناہمواریوں کا حل ڈھونڈنا پڑے گا۔ غربت اور عدم تحفظ کہیں بھی ہو اس کے فوری اور براہ راست مضمرات ہوتے ہیں' چاہے یہ دور دراز کے علاقوں میں ہی کیوں نہ ہوں' عالمی غربت اور سکیورٹی جس طرح آج باہم منسلک ہے پہلے کبھی نہیں تھی۔

ہمیں عالمی رہنماؤں کی طرف سے Millennium Development Goals کے وعدوں کو ہر صورت میں پورا کرنا ہوگا۔ اس اجلاس اور اس کے بعد مانٹریال اور جوہانسبرگ میں ہونے والے اجتماعات میں طے شدہ حکمت عملیوں کے نفاذ کی رفتار تیز کرنا ہوگی تاکہ ہم تعلیم' صاف

ہوا اور پانی اور سماجی انصاف کے مساوی مواقع باہم فراہم کرسکیں۔ یہ کام ترقی یافتہ اور ترقی پذیر دونوں قسم کے رہنماؤں کا ہے وہ غربت میں کمی اور امن کے لیے ماحول کو سازگار بنائیں۔

ہم جانتے ہیں کہ مقامی سطح پر الیکشن مقامی ایشوز کی بنیاد پر جیتے یا ہارے جاتے ہیں' عوامی اجتماعات میں پنشن' صحت عامہ اور روزگار پر تو گرماگرم بحث ہوتی ہے لیکن ترقیاتی کاموں پر ایک لفظ نہیں کہا جاتا' لیکن یہ عالمگیر مسائل ہیں' بالخصوص غربت' جو دنیا کو ایسے سانچے میں ڈھال لیں گے جس میں ہماری آنے والی نسلیں زندہ رہ سکیں۔ ترقی اور غربت کے خلاف لڑائی نہ صرف مقامی بلکہ بین الاقوامی ایشوز ہیں۔

موجودہ حالات میں سماجی ناہمواریاں ختم کرنے کے لیے عالمی برادری کا عزم اتنا نہیں جتنی کہ ضرورت ہے۔ آج امداد کی جو سطح ہے وہ پہلے سے کم ترین سطح پر ہے۔ یہ شرح 1960ء کے عشرے میں جی ڈی پی کا 0.5 فیصد تھی جواب کم ہوکر 0.25 یعنی نصف ہوچکی ہے اور یہ ان حالات میں ہو رہا ہے جب ترقی یافتہ ممالک میں آمدن تاریخ کی بلندترین سطح پر ہے۔

جہاں امیر ممالک سالانہ 700 ارب ڈالر فوجی اخراجات پر اور 300 ارب ڈالر غذائی سبسڈی کی مد میں مختص کرتے ہیں وہاں ترقیاتی امداد کی مد میں صرف 68 ارب ڈالر خرچ کیے جاتے ہیں' یہ اعداد وشمار چیخ چیخ کر بول رہے ہیں' یہ دراصل فیلوشپ' مکالمے اور تبدیلی کی صدا ہے۔

مختلف مذاہب' ایک مقصد

اس دنیا میں باہمی رابطے اور ایک دوسرے پر انحصار ایک حقیقت ہیں اور تیز شرح سے ان کی رفتار بڑھتی جارہی ہے' ان رابطوں کا اظہار مختلف ذرائع سے ہو رہا ہے' اس منطق سے کہ کوئی مذہب یا کلچر دوسرے سے بالاتر ہے' ہٹ کر اصل سوال اور چیلنج یہ ہے کہ مختلف کلچروں اور مذاہب میں کس حد تک رواداری اور مفاہمت کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے ایک اور چیز کی ضرورت ہوگی' وہ یہ کہ کلچر اور مذہب کو عالمی ریاستی امور اور ترقی کے قانونی ضابطے کے تناظر میں دیکھنا ہوگا' کلچر اور مذہب محض نظریاتی نہیں بلکہ بہت زیادہ عملی ایشوز ہیں' تاریخی قوتوں مذہب اور ثقافت کو بہتر طور پر سمجھے بغیر امن' ترقی' غربت کے خاتمے اور معاشی پلاننگ کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی۔ مختلف

ثقافتوں اور مذاہب کے لیڈروں کو چاہیے کہ وہ ان ایشوز کو ٹھیک طرح سے سمجھیں اور یہ غور کریں کہ کن پروگراموں سے سکیورٹی دوبارہ بحال ہوسکتی ہے اور دیرپا اقتصادی ترقی کیسے ممکن ہے؟

بالخصوص ہمیں اعتدال پسند مسلم کمیونٹی سے بہت کچھ سیکھنا پڑے گا' ان کمیونٹی کے ترجمانوں اور لیڈروں کو آگاہی اور توانا حل کا حقیقی ذریعہ سمجھنا چاہیے اور انہیں محض' سہولت اتحادی خیال نہیں کرنا چاہیے۔

جیسا کہ کئی قارئین یہ تسلیم کریں گے کہ عقائد کے مابین مکالمہ اور کمیونٹی کی ترقی میرا خصوصی شعبہ ہے' کیونکہ میں عالمی بنک میں کئی اہم مباحثوں میں شریک رہا ہوں' مذہبی بنیادوں پر قائم تنظیمیں ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں میں کافی اثر ورسوخ کی حامل ہیں' یہ تنظیمیں غریبوں کے ساتھ سماجی بے انصافی اور عدم مساوات کے موضوعات پر غیر متزلزل آواز اٹھاتی رہتی ہیں۔ بالخصوص ترقی پذیر ملکوں میں مذہبی طور پر قائم تنظیمیں مقامی کلچر میں رچی بسی ہوئی ہیں اور غربت کی جڑوں اور اس کے تدارک کو اچھی طرح سمجھتی ہیں' ان کا اپنی کمیونٹی سے عملی رابطہ ہوتا ہے...... شادی' پیدائش' مرگ' مختلف مسائل کے وقت ...... یہ اقدار اور رویوں پر نہایت اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتی ہیں' جس طرح ان تنظیموں کا نچلی سطح پر لوگوں سے رابطہ ہے اس طرح کسی اور ادارے کا نہیں۔

مختلف دستاویزات خصوصاً عالمی بنک کی رپورٹ ''Voices of the Poor's'' ظاہر کرتی ہے کہ مذہبی تنظیمیں نچلی سطح پر حکومت' سیکولر گروپوں اور ڈونرز سے زیادہ اعتماد اور اعتبار کی حامل ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ سماجی خدمات فراہم کرنے کا بڑا ذریعہ ہیں' کئی ممالک میں تو یہ نصف یا زائد صحت وتعلیم کی سہولت کی فراہم کنندہ ہیں' بلکہ تنازعات والے علاقوں میں تو یہ سماجی خدمات کا واحد ذریعہ ثابت ہوتی ہیں' یہ وہ ادارہ ہے جس نے اپنا نمایاں مقام بنایا ہے۔

اختلافات کو قبول کرتے ہوئے مذاہب کے مابین ہم آہنگی کا قیام ممکن ہے' میں نے خود اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر' افریقی معاشروں میں لوگ ایک دوسرے پر رقیق حملے کیے بغیر مختلف مذاہب کے افراد کے لیے احترام کا جذبہ رکھتے ہیں۔

یہ بات ذہن میں لانی نہیں چاہیے کہ مذہبی ہم آہنگی کا مقصد ممکن حاصل نہیں کیا جاسکتا' یقیناً یہ ایک امکان ہے جسے نظریاتی تبدیلیوں کے جواز کے طور پر نہیں بلکہ عملی انسانی سٹریٹجی کی حیثیت سے

دیکھنا چاہیے۔ اکثر آسمانی کتابیں اس حوالے سے واضح مؤقف رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن فرماتا ہے:

''یقیناً خدا پر ایمان رکھنے والے' یہودی' عیسائی اور اسلام قبول کرنے والے' ہر وہ شخص جو اللہ پر یقین رکھتا ہے' یوم قیامت پر ایمان رکھتا ہے' نیکی کی زندگی بسر کرتا ہے کو اللہ سے اس کا اجر ضرور ملے گا' انہیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت ہے نہ ملول ہونے کی۔'' (2:62)

اسی پیرائے میں آنجہانی پوپ جان پال دوم نے کہا: ''مذہب کے نام پر کسی کو نقصان پہنچانے اور تشدد کو فروغ دینے اور تصادم کرنے والے مذہب کی خوفناک تردید اور خدا کے خلاف جارحیت کے مترادف ہے۔'' تشدد اور فساد کو مذہب کے نام پر ہوا دینا تمام مذاہب کے منافی ہے۔ دہشت گردوں کو امن' رواداری کا دشمن اور عالمی غربت کے خاتمے میں رکاوٹ کا نام دینا چاہیے۔

ایک خاندان: انسانیت

ہماری اس ایک دنیا کو توازن میں لانے کے لیے تمام خطوں کی ایک نیکی کی حیثیت سے شمولیت کی ضرورت ہے۔ ہزاروں نہیں کروڑوں لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے کامیاب منصوبوں کے اجرا اور ان کی رفتار تیز کرنے کے لیے حکومتوں' کاروباری دنیا' سول سوسائٹی اور یک جہت و کثیر الجہت اداروں کے درمیان اشتراک کارناگزیر ہے۔

غیر سرکاری اداروں کا حجم' رفتار' علم اور تجربہ کافی بڑھ چکا ہے' وسیع التناظر سرگرمیوں میں ان کا کردار اب بنیادی نوعیت کا سمجھا جاتا ہے' اسی طرح پرائیویٹ سیکٹر بھی مواقع کی فراہمی میں نہ صرف توانا آواز ہے بلکہ سماجی خدمات کی فراہمی' سماجی ذمہ داریا ور ماحولیاتی تحفظ میں ان کی اہمیت ازبس ہے۔

بہتر معیار زندگی' بہتر تعلیم اور صحت عامہ تک رسائی صرف امیروں نہیں غریبوں کے لیے بھی امید کی بنیاد ہیں۔ غربت سے پاک دنیا والا ورلڈ بنک کا خواب ہے' یہ محض اخلاقی ایشو نہیں بلکہ عالمی سلامتی کی اساس ہے۔ یوں اولین ایشو یہ ہے کہ دنیا اس مقصد کے حصول اور اس کے لیے درکار وسائل کی فراہمی کو معیشت بنانے کے لیے کتنی سنجیدہ ہے۔

ہمیں مکالمے اور عمل میں پُرعزم ہونا ہوگا اور ہمارے دور کے عہد کو ایفا کرنے کے لیے مشترکہ

اقدار اور عقائد کو بروئے کار لانا ہوگا' جیسا کہ قدیم عہدنامے میں لکھا ہے اور ہم بھی اس طرح کر سکتے ہیں۔''دریاؤں کے پانیوں سے اگائے گئے درخت سے اپنے موسم میں پھل حاصل ہوتا ہے' اس کے پتے بھی نہیں جھڑتے اور اس کے فائدے ہی فائدے ہیں۔'' (Psalm 1:3)

نوٹس

1- سموئیل پی ہنٹنگٹن......تہذیبوں کا تصادم۔1996ء
2- وائسز آف دی پوور۔ دیپا نارائن ۔ 2000ء



باب 25

سخت طاقت اور نرم طاقت

جوزف ایس نائے جونیئر

طوائف الملو کی والی اس دنیا میں طویل عرصے سے بین الاقوامی سیاست کو طاقت اور سکیورٹی کی طلب کے حوالے سے بیان کیا جاتا رہا ہے۔ ریاستیں اتحاد بناتی ہیں اور اپنی آزادی کے تحفظ کے لیے دوسروں کی طاقت میں توازن لاتی ہیں' روایتی طور پر ہم ایسی ریاستوں کو ''بغض معاویہ'' پر مبنی اتحادی قرار دے سکتے ہیں۔ فرانس نے برطانیہ سے اس لیے اتحاد کیا کیونکہ اسے جرمنی کا خوف تھا......اس میں نظریات یا اخلاقیات کا عنصر بہت کم کارفرما تھا۔

تاہم کثیر القومی تعلقات کو زیادہ طویل عرصے تک پس پشت نہیں ڈالا جاسکتا۔ 11 ستمبر 2001ء کو ایک کثیرالقومی دہشت گرد تنظیم نے حملہ کر کے اتنے امریکی مار ڈالے جتنے کہ 7 دسمبر 1941ء کو جاپانی قوم نہیں مار سکی تھی۔ امریکہ کی قومی سلامتی کی سٹریٹجی اب یہ کہتی ہے کہ ''ہمیں اب اتنا خطرہ دشمن فوجوں یا جنگی بیڑوں سے نہیں جتنا کہ تباہ کن ٹیکنالوجی چند جنونی افراد کے ہاتھوں لگنے سے ہے۔'' سٹریٹجک دشمنی کی جگہ ''آج دنیا کی بڑی طاقتیں ہمارا ساتھ دے رہی ہیں۔ یہ سب دہشت گردانہ تشدد اور بہتری کے مشترکہ خطرے کی بنیاد پر متحد ہیں۔''

فوجی طاقت اور معاشی طاقت دونوں ''سخت کمانڈ'' کی ایسی طاقتیں ہیں جو دوسروں کا مؤقف تبدیل کرنے کے لیے استعمال کی جاسکتی ہیں۔ یہ سخت طاقت مراعات پر بھی مشتمل ہوسکتی ہے اور ڈنڈے پر بھی' لیکن اس کے علاوہ بھی ایک بالواسطہ راستہ ہے جس سے ''طاقت کا دوسرا چہرہ'' کا نتیجہ حاصل کیا سکتا ہے۔ کوئی ملک عالمی سیاست میں شاید مطلوبہ نتائج حاصل کرسکتا ہے۔ کیونکہ دیگر ممالک اس کی تقلید کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی اقدار کی معترف ہوتے ہیں۔ اس کو بطور مثال اختیار کرنا

چاہتے ہیں اور اس کی خوشحالی اور کھلے پن کی سطح تک پہنچنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ بات نہایت اہم ہے کہ آپ عالمی سیاست کے لیے اپنا ایجنڈا پیش کریں اور دوسروں کو متوجہ کریں کیونکہ فوجی یا معاشی ہتھیاروں کے استعمال سے آپ انہیں تبدیلی پر بزور مجبور کرسکتے ہیں۔ یہ نرم طاقت...... دوسروں سے وہ نتائج حاصل کرنا جو آپ چاہتے ہیں......لوگوں کو متنفر ہونے کی بجائے معاون بنا دیتی ہے۔

چین کے تیانمن سکوائر پر جمع ہونے والے طلباء جو آہنی پردے کے پیچھے امریکی موسیقی' خبریں اور ریڈیو فری یورپ سنتے تھے' کے اثرات کا سوچیں' یہ لوگ مجسمہ آزادی کی علامت بن گئے جب آپ لوگوں کو وہ کچھ مانگنے کے لیے قائل کر لیتے ہیں جو آپ چاہتے ہیں تو آپ کو گاجر اور ڈنڈے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اپنی ترجیحات کے تعین کی صلاحیت طاقت کے وسائل' پرکشش ثقافت' سیاسی اقدار' اداروں اور اخلاقی جواز پر مبنی پالیسیوں سے منسلک ہوتی ہے' اگر میں آپ کو وہ کچھ کرنے کے لیے قائل کر لیتا ہوں جو میں چاہتا ہوں تو مجھے بزور وہ کچھ کرانے کی ضرورت نہیں جو آپ نہیں چاہتے۔ اگر کسی ملک کی اقدار ایسی ہیں جو دوسروں کے لیے قابل تقلید ہیں تو قیادت کی کم قیمت چکانا پڑے گی' نرم طاقت کا اثر کوکا کولا اور نیلی جینز سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ کسی ملک کی دوسرے ملک متاثر کرنے کی صلاحیت اس کے روایات اور اندرونی تمدن سے جنم لیتی ہے' اس کے علاوہ خارجہ پالیسی کے جواز سے بھی اس کا تعلق ہوتا ہے۔ جب دوسروں کی نظر میں ہماری پالیسیاں جواز رکھتی ہیں تو ہماری نرم طاقت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

امریکہ اگرچہ فوجی طاقت کے لحاظ سے انتہائی بالا دست ہے لیکن اقتصادی محاذ پر اس کی یہ پوزیشن نہیں (دوسری طرف یورپ متحدہ کردار ادا کر رہا ہے)' انفارمیشن کے انقلاب اور گلوبلائزیشن نے کثیر القومی ایشوز پر غیر ریاستی عناصر کو توانائی بخشی ہے اور یہ صورتحال 1970ء کے عشرے سے قطعی مختلف ہے۔ یہ نتیجہ کافی پیچیدہ ہے' عالمی سیاست میں سہ جہتی ایشوز پائے جاتے ہیں۔ ہر ایشو طاقت کی تقسیم کا مختلف ڈھانچہ رکھتا ہے۔ ایک طرف جہاں فوجی ایشوز پر طاقت کی تقسیم یک قطبیہے۔ اس بات کی کوئی ضرورت نظر نہیں آتی کہ ہم معاشی ایشوز کی وضاحت کے لیے روایتی اصطلاح

استعمال کریں۔ کیونکہ بہرحال امریکہ کو بھی اپنے ترجیحی نتائج کے حصول کے لیے دوسروں کی مدد کی ضرورت ہے۔ سخت طاقت ایسی دنیا میں اہمیت کی حامل ہے جہاں ریاستیں دہشت گردوں کی تشدد پسندی سے بچاؤ اور اپنی آزادی برقرار رکھنے کی کوششوں میں مصروف ہیں' تاہم دہشت گردوں کو حامیوں کی بھرتی سے روکنے اور کثیرالقومی ایشو کے کثیرالفریقی حل اور تعاون کے لیے نرم طاقت کی اہمیت بڑھتی چلی جائے گی۔

یہ صورتحال 11 ستمبر 2001ء کے بعد ناگزیر بن گئی جب غیر ریاستی کرداروں پر مشتمل ایک عالمگیر تنظیم نے امریکہ پر حملہ کیا۔ گلوبلائزیشن محض معاشی مظہر نہیں بلکہ اس نے قدرتی تقسیم کو سکیڑ دیا جو روایتی طور پر ہمیں نظر آتی تھی۔ 11 ستمبر نے بھی ڈرامائی انداز میں انفارمیشن کے انقلاب اور ٹیکنالوجی کے تبدیلی کے ذریعے کثیرالقومی ایشوز کی اہمیت کو ابھارا اور غیر ریاستی اداروں کو عالمی سیاست میں کردار ادا کرنے کا موقع فراہم کیا۔ چند دہائیوں پہلے عالمی مواصلات کی سہولتیں اتنی مہنگی تھیں کہ حکومتوں' اداروں' کیتھولک چرچ اور کثیرالقومی کارپوریشن کی پہنچ سے بھی دور تھیں' اس وقت امریکہ اور سوویت یونین خفیہ طور پر سیٹلائٹ سے فوٹوگرافی کی مد میں اربوں ڈالر خرچ کر رہے تھے' اب ایسی تصاویر انتہائی سستی قیمت میں ہر کسی کے لیے دستیاب ہیں۔ دنیا کی 1500 این جی اوز نے سیاٹل میں ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے اجلاس کو نہایت کم خرچ پر درہم برہم کر دیا۔

زیادہ پریشان کن امر یہ ہے کہ ان سہولتوں کو دہشت گردی کے مقاصد کے لیے بھی باآسانی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ دہشت گردی کوئی نئی چیز نہیں لیکن ٹیکنالوجی عام ہونے سے حالیہ عشروں میں دہشت گردوں کی سرگرمیاں زیادہ مہلک اور مؤثر ہو چکی ہیں۔ بیسویں صدی میں ہٹلر اور سٹالن جیسے لوگوں کو لاکھوں افراد کے قتل عام کے لیے حکومتی طاقت کی ضرورت تھی' اگر 21ویں صدی میں دہشت گرد وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں تو پہلی مرتبہ باغی گروپوں کو خوفناک طاقت مل جائے گی۔ ریاستی امور کے تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ دہشت گردی کی سرپرستی کرنے والی حکومتوں کو سزا دینے سے مسئلے کا حل نکل سکتا ہے۔ یہ حل کرنے میں معاون تو ہو سکتا ہے لیکن اس سے وہ اثرات ختم نہیں ہوں گے جو افراد کو ٹیکنالوجی کے عام ہونے سے فائدہ پہنچاتے ہیں' جنگ کی یہ ''نجکاری'' نہ صرف عالمی سیاست میں ایک بڑی

تاریخی تبدیلی ہے بلکہ اگر دہشت گرد ایٹمی ہتھیار حاصل کر لیتے ہیں تو یہ جدید شہروں اور معاصر تہذیب کے لیے انتہائی تباہ کن اثرات مرتب کرے گی۔

دہشت گردی کے خلاف موجودہ جنگ میں امریکی فوج نے افغانستان میں بڑی آسانی سے طالبان حکومت کو نکال باہر کیا' لیکن اس سے پوری دنیا کے 50 ممالک میں القاعدہ نیٹ ورک کے صرف ایک تہائی حصے کو سبوتاژ کیا جا سکا' دوست ملکوں میں ایسے سیل موجود ہونے سے یکطرفہ فوجی حل ناقابل عمل ہے' دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے برسوں پر مشتمل صبر آزما شہری تعاون' انٹیلی جنس کے اشتراک' پولیس اور مالیاتی وسائل روکنے کی ضرورت ہوگی' ایسی جنگ ایک سامراجی ہیڈکوارٹر سے جاری یک طرفہ احکامات سے نہیں جیتی جا سکتی۔

نئے چیلنجوں سے نمٹنے کے لیے صرف فوجی یا معاشی طاقت پر انحصار کافی نہیں بلکہ کلچر' اقدار' دیگر لوگوں سے مشاورت پر مبنی پالیسیوں کی نرم طاقت کا استعمال کرنا ہوگا' دوسرے لوگوں کے مفادات کو بھی مدنظر رکھنا پڑے گا' جیسا کہ جرمن ایڈیٹر جوزف جوف کہتے ہیں کہ ''ماضی کے برعکس جب جنگیں ایک بڑے حل کے طور پر لڑی جاتی تھیں آج طاقت کی دلچسپ اقسام بندوقوں کی نال سے برآمد نہیں ہوتیں...... آج اہم ترین بات یہ ہے کہ آپ دوسروں کو اس بات پر متوجہ کریں جو آپ چاہتے ہیں اور ایسا ثقافتی کشش اور نظریے سے ممکن ہے' اس کے علاوہ تعاون کی بڑی مراعات کا ایجنڈا طے کرنا پڑے گا۔''

دنیا کو آج درپیش بڑے چیلنجوں سے نمٹنے کے لیے ثقافتی اور تعلیمی تبادلوں کے کلچر کی ترقی کی طویل المدت سٹریٹجی کی ضرورت ہے تاکہ مشرق وسطیٰ میں زیادہ امیر اور کھلی سول سوسائٹی فروغ پاسکے' اس ضمن میں زیادہ کردار حکومتیں' یونیورسٹیاں' فاؤنڈیشنیں اور دیگر غیر منافع بخش ادارے ادا کرسکتے ہیں۔ جمہوریت کے فروغ کے حالات سازگار بنانے اور نرم طاقت کے وسائل پیدا کرنے کے کئی راستے ہیں' لیکن ان میں سے کوئی بھی اس وقت تک مؤثر نہیں ہوسکتا جب تک امریکہ کی پالیسیاں وسیع تر جمہوری پیغام کی حامل نہیں ہو جاتیں۔

چونکہ دہشت گردی کے خلاف جنگ اسلامی تہذیب کے اندر بنیاد پرستوں اور اعتدال پسندوں کی خانہ جنگی پر بھی مشتمل ہے لہٰذا اسلام پسندوں کی نرم طاقت ایک پریشان کن علامت

ہے'ان حالات میں امریکیوں کو اعتدال پسند طبقے کی مضبوطی کے لیے بہتر مواقع تلاش کرنا پڑیں گے'اعتدال پسند یہودی' معبد اور عیسائی چرچ اعتدال پسند مسلمانوں کے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں۔ ان تمام تینوں مذاہب میں حضرت ابراہیمؑ کو انتہائی احترام کا درجہ حاصل ہے۔ لہٰذا انسانوں' عیسائیوں اور یہودیوں میں ابراہیمی مکالمے کا آئیڈیا وہ مثال ہوسکتی ہے جس کی تقلید پر نرم طاقت کے حصول کو ممکن بنانے کے لیے غیر ریاستی کردار ادا کر سکتے ہیں۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ امریکیوں کو ثقافتی اختلافات میں سے زیادہ آگاہ ہونا پڑے گا۔ ہمیں خارجہ امور سے لاتعلقی کم کر کے زیادہ حساس ہونا ہوگا'اس سلسلے میں پہلا قدم یہ ہوسکتا ہے کہ ہم یہ جانیں کہ ہماری پالیسیوں دوسروں کو کیسے محسوس ہوتی ہیں اور ثقافتی فلٹر سے گزر کر وہ ہماری آواز کیسے سنتے ہیں' نرم طاقت کو زیادہ مؤثر طریقے سے استعمال کرتے ہوئے ہمیں اپنے اندرونی اور پھر بیرونی رویوں میں تبدیلی لانا پڑے گی۔ اس کے لیے امریکیوں کو دوسرے افراد کو بھی سننا ہوگا' نرم طاقت اپنی ہیئت کے اعتبار سے سخت طاقت کی بہ نسبت کہیں کم یکطرفہ سمجھی جاتی ہے'اور ہمیں یہ سبق سیکھنے کی ضرورت ہے کہ اگر ہم دوسروں کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں' جو ہمارے بنیادی مقاصد سے متفق ہیں تو دنیا زیادہ آزاد اور محفوظ ہوجائے گی۔

نوٹ

(1) جوزف جوف کا نیویارک ٹائمز میگزین میں شائع ہونے والا مضمون بعنوان

America the In escapable 2 June, 8, 1997 , p.38

باب26

بین الانحصار دنیا میں عالمی گورننس

بنجمن آر باربر

عراق میں دہشت گردی کی ہولنا کیوں سمیت امریکی جنگ' وہاں جیلوں میں امریکی بدسلوکی کے واقعات اور عراق میں جمہوریت کے آغاز کی کوششوں نے دنیا کو اپنی طرح متوجہ کرلیا' لیکن اس کے پس منظر میں گلوبل گورننس کے عوامل کارفرما تھے' جوکہ دنیا کا ایک سلگتا معاملہ اور چیلنج ہے۔ 60 سالہ تعمیری مشترکہ تجربے کے برعکس یورپ تک مشترکہ جمہوری گورننس کے مقصد کے حصول کا تجربہ کامیاب نہیں ہوسکا۔ بظاہر متحد رہنے والے یورپی ممالک میں سویڈن کے شہریوں نے یوروکرنسی کے اجراء کے حوالے سے ووٹ نہیں ڈالا' ڈینش زبان اور انگریزی کے درمیان مخاصمت بھی سامنے ہے۔ ترکی تک یورپی منڈی کی توسیع اور سابق سوویت یونین کی 6 ریاستوں سمیت 15 نئی اقوام کو یورپی یونین میں شامل کرنے کی پیچیدگی بھی ایک حقیقت ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کی بڑی امید اقوام متحدہ پہلی اور تیسری دنیا میں گروپ بندی اور جھگڑوں کا تدارک نہیں کرسکی اور اکثر چیخ و پکار کرنے والوں کو ریلیف پہنچانے میں ناکام نظر آتی ہے' اسی طرح امریکہ جو نئے بین الاقوامی نظام کا خالق ہے خود اپنی تخلیق سے پیٹھ موڑ کر کثیر الجہتی اقدامات کی بجائے سکیورٹی کے نام پر تھانیداری اور جنگ کا رسیا دکھائی دیتا ہے' اس کی واضح مثال امریکہ کی عراق میں مہم جوئی ہے۔ مختصر یہ کہ علاقائی اور عالمی گورننس کی ضرورت بڑھنے کے ساتھ' ساتھ امکانات معدوم ہوتے چلے جارہے ہیں۔ اور اب' اور اب! 11 ستمبر کے تباہ کن واقعات اس بات کے بیّن ثبوت ہیں کہ دنیا عام امن سے کتنی دور ہے' اس کے علاوہ اس سے عالمگیر انحصار کی حقیقت بھی آشکار ہوئی جس نے عالمگیر گورننس کو پہلے سے کہیں زیادہ ضروری بلکہ ناگزیر بنادیا ہے۔ 9/11 کا حقیقی پیغام آج کی دنیا کی مشترکہ منزل کی نشاندہی کرتا ہے۔

یورپ پہلے ہی دوسری جنگ سے بین الانحصاریتInterdependence کا سبق سیکھ چکا ہے' جبکہ تیسری دنیا جو پہلی دنیا پر بڑی حد تک انحصار کرتی ہے کہ اسے حقیقی خود انحصاری نہیں میسر آ سکی۔

بہرحال 228سال پہلے اس یقین کہ آزادی اور خودمختاری آزاد قوم کا مقدر ہے کے ساتھ امریکہ نے اپنی آزادی کا اعلان کیا۔ پوری دوصدیوں تک امریکہ نے حقوق اور سماجی انصاف پر مبنی خودمختاری کے تصور کو پروان چڑھایا اور یوں ایک زیادہ جمہوری اور آزاد ملک بن کر ابھرا' نہ صرف اپنے ملک بلکہ دوسروں کے لئے آواز بلند کرتے ہوئے (جیسا کہ صرف بش نے کہا کہ) اس نے زور دیا کہ جمہوریت کا تعلق قومی آزادی سے ہوتا ہے اور یہ کہ شخصی آزادی کے لئے قومی آزادی کا ہونا ضروری ہے۔

15برس پہلے بڈالیسٹ' پراگ' وارسا' ماسکو اور پورے مشرقی یورپ اور ایشیا نے سوویت کمیونزم سے علیحدگی اختیار کرکے آزادی اور خودانحصاری کے درمیان طاقتور تعلق کا ثبوت دیا' انہوں نے ایک بار پھر سیلف گورننس کا حق حاصل کرلیا' آج جب یہ قومیں یورپ میں شمولیت کی کوشش کر رہی ہیں' دنیا کے دیگر حصوں میں افغانستان' لائبیریا' کوسوو اور برازیل خودمختاری کے حصول اور اندرونی آمریت جبکہ غیرملکی سامراج سے نجات کے لیے کوشاں ہیں اور یہی ان کے عوام کی آزادی کی علامت ہے۔

حالیہ تاریخ سے سبق لیتے ہوئے ایسی اقوام جو طویل مدت تک اپنی آزادی سے لطف اندوز ہوتی رہیں یا حال ہی میں آزادی حاصل کی ہے کو اب یہ سمجھ آ رہی ہے کہ محض خودانحصاری کے بل بوتے پر آزادی' مساوات نہ آمریت یا دہشت گردی سے بچاؤ ممکن ہے' ایک ایسی دنیا جہاں ماحولیات' صحت عامہ' مارکیٹ' ٹیکنالوجی اور جنگ ہرکسی کو متاثر کرتی ہے میں باہم انحصار ایک ایسی حقیقت ہے جس پر انسانی تعاون کا دارومدار ہے اور یہ کہ جہاں خوف کی حکمرانی ہو اور دہشت گردی کا سامنا Shock and awe سے ہو۔ وہاں امن اور جمہوریت دونوں کا حصول مشکل ہے' اور چونکہ ابھی ہمیں ایسے عالمی ادارے قائم کرنا ہیں جو ہمیں باہم انحصاری سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کریں' لہٰذا ہم پر ایسی عالمگیر چیزیں مسلط ہیں جو انارکی اور برائی پر مشتمل Inter

dependence کی عکاس ہیں' اور یہ کہ باہم انحصار کو جمہوری بنانے کے نئے سفر کی عدم موجودگی میں ہم جمہوری خود انحصاری کے پرانے سفر کے ثمرات سے ہاتھ دھو سکتے ہیں۔

پہلے جہاں قومیں اپنی منزل کے حصول کے لیے صرف سالمیت پر انحصار کرتی تھیں وہاں آج وہ ایک دوسرے پر انحصار کرتی ہیں' ایسی دنیا جہاں بعض لوگوں کا عفریت دوسرے لوگوں کی امارات کو فزوں تر کرتا ہے' جہاں کوئی بھی محفوظ نہیں' وہاں کثیر الجہتی ایک خواب نہیں حقیقت ہوتی ہے۔ نائن الیون کا سبق یہ نہیں تھا کہ امریکہ جیسا ملک یکطرفہ پیشگی حملہ کر کے خودسر ریاستوں کو تہس نہس کر دے تاہم یہ خود مختار ملک ایک دیوما لائی عفریت ہے' ایچ آئی وی' گلوبل وارمنگ' بین الاقوامی تجارت' ایٹمی عدم پھیلاؤ' کثیر القومی جرائم اور اذیت ناک سزا کے معاملات پہلے ہی امریکہ سے چھین لیے گئے ہیں' حالانکہ یہ نائن الیون کے دہشت گردانہ حملے سے پہلے مثالی سالمیت کا اہم حصہ تھے۔

تو پھر ستم ظریفی یہ ہے کہ سالمیت امریکہ کے بین الاقوامی امور کا اولین اصول سمجھی جاتی ہے' اس کی حقیقت کو پہلے ہی باہم انحصار کی حقیقتوں پر مہلک سمجھوتہ کر کے نقصان پہنچایا گیا' یہاں تک کہ امریکہ اگر غیر ملکی کمانڈروں کے ماتحت اپنی فوجیں باہر بھجوانے سے انکار کر دیتا ہے اور دفاعی جنگ کے نظریے کا نفاذ کر کے خود مختاری کا یہ حق استعمال کرتا ہے کہ وہ کسی بھی جگہ پر کسی کے بھی خلاف جنگ شروع کر دے' اپنی عالمگیر اقتصادی طاقت سے قطع نظر امریکہ کے پاس اب کسی بھی کمپنی یا فیکٹری میں ایک بھی ایسی جاب نہیں جو ماہرین کو بیرون ملک زائد منافع کمانے کے لیے جانے سے روک سکے۔ تارکین وطن ''وائرسوں'' کو اپنی حدود میں داخل ہونے سے نہیں روک سکتا' مالیاتی سرمائے کو کنٹرول نہیں کر سکتا اور انٹرنیٹ پر انٹلیکچوئل ذہانت کی چوری ختم نہیں کر سکتا۔ خود مختاری بدستور ایک طاقت ور لفظ اور قوموں کے درمیان عظیم ڈیل کا جواز رہے گا تاہم اس کی حقیقت اپنی وقعت کافی حد تک کھو چکی ہے' دیگر بین الاقوامی جرائم کی طرح دہشت گردی بھی دراصل خود مختاری کی کمی کا ثبوت ہوتی ہے۔ امریکہ تجارتی مرکز ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور فوجی مشین پینٹاگون پر حملہ کیوں نہیں روک سکتا تھا' کیونکہ حملہ آور فورس صرف باکس کٹروں اور جنونی جذبے سے لیس تھی۔ درحقیقت ہائی جیکر امریکہ کے باہر سے نہیں بلکہ اندر سے آئے تھے اور حملے سے قبل جن

ریاستوں نے انہیں پناہ دے رکھی تھی وہ افغانستان یا عراق نہیں بلکہ نیوجرسی اور فلوریڈا تھیں' یہ سب کچھ خودمختاری کی وجہ سے تھا۔

اس کے باوجود امریکہ تن تنہا کھیلنے کو ترجیح دیتا نظر آتا ہے..... گیری کوپر اپنی فلم ''ہائی نون'' میں دکھاتے ہیں کہ کس طرح شیرف اکیلے چار غنڈوں سے لڑتا ہے۔

تاہم حالیہ واقعات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ ایسی دنیا ہے جو صرف عالمگیر حیثیت میں برقرار رہتی ہے..... مختلف طبقات مل کر کام کر رہے ہیں..... اور ان کے پاس کامیابی کے مواقع ہیں' باہم انحصار اب ہماری ایک حقیقت ہیں اور اس کا اعتراف مؤثر خارجہ پالیسی کا نکتہ آغاز ہے' بہرحال دہشت گرد کوئی قوم نہیں ہیں اور چاہے خودسر ریاستیں ان کی حمایت کرتی ہیں یا نہیں' انہیں ایسی این جی اوز سمجھا جا سکتا ہے جو بین الاقوامی نظام کے ایک چھوٹے سے حصے میں سرگرم ہیں۔ یہ لوگ جدید کثیر القومی مالیاتی نیٹ ورک کے ٹیلی کمیونیکیشن' ٹرانسپورٹیشن اور کاروبار کو سرحد پار اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں' اگر ان سے متصادم ریاستیں انہی کی طرح بین الاقوامی لوازمات سے فائدہ نہیں اٹھاتیں تو اس بات کی بہت کم امید ہے کہ دہشت گردوں پر کبھی قابو پایا جا سکے گا۔

اب جبکہ بین الاقوامی تعاون کو ضروری سمجھتے ہوئے اس کی خواہش کی جاتی ہے' یہ بات واضح ہے کہ وہ لوگ جو گلوبل گورننس کے اداروں کا قیام چاہتے ہیں کی راہ میں حائل رکاوٹیں اتنی ہی زیادہ ہیں جتنی اس کی ضرورت ہے' اس کی ایک مثال بش انتظامیہ کی طرف سے بارودی سرنگوں پر پابندی کی مفاہمت پر بات چیت سے انکار ہے (اس معاہدے پر 140 سے زائد ممالک دستخط کر چکے ہیں)۔

امریکہ کے پاس کافی معقول جواز موجود ہے کہ وہ معاہدے پر دستخط کرنے والے ممالک سے یہ توقع رکھے کہ وہ بحیثیت عالمی تھانیدار اس کی خصوصی ذمہ داریوں کو تسلیم کریں اور بارودی سرنگیں فوجیوں کے تحفظ کے لیے نصب کی گئی ہیں' لیکن اس کے ساتھ امریکہ کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ایسا مسودہ تیار کرنے کی زبردست کوشش کرے' جس پر وہ بھی دستخط کرے۔

اسی نوعیت کی بعض مشکلات کا سامنا نوتشکیل شدہ انٹرنیشنل کریمنل ٹریبونل کو بھی ہے' امریکہ کا یہ خیال ہے اور کسی حد تک یہ درست بھی ہے کہ یہ نئی عدالت اقوام متحدہ کی امن فوج کے حوالے سے

’’کنگرو کورٹ‘‘ ثابت ہوسکتی ہے‘ لیکن باہم انحصار کے اثرات ایسے مذاکرات کے متقاضی ہیں جو امریکہ کو منافقانہ طور پر ’’خصوصی ذمہ داریوں‘‘ کے بہانے کی بجائے موزوں شرائط پر عالمی برادری سے مل کر کام کرنے پر رضامند کرسکیں۔

باالفاظ دیگر چاہے یہ بارودی سرنگوں پر پابندی کا معاہدہ ہو یا کریمنل کورٹ یا گلوبل وارمنگ پر کیوٹو پروٹوکول جیسا کوئی اور سمجھوتہ ہو‘ موجودہ صورتحال میں یہ امریکہ کو عالمی سطح پر تنہا کرنے کا باعث ہیں۔ عراق جنگ سے قبل اقوام متحدہ میں لڑائی اس لیے تھی کہ امریکہ کثیرالقومی تعاون کی بجائے تن تنہا کارروائی چاہتا تھا اور اقوام متحدہ اس پر عملدرآمد سے خوفزدہ تھا‘ اس کی وجہ یہ ہے کہ خودمختاری اقوام متحدہ کا اولین اصول ہے‘ یہ ادارہ اقوام عالم کی کانگریس ہے اور سیکرٹری جنرل کا عہدہ دنیا کے عوام کی بجائے ان ممالک کا نمائندہ ہوتا ہے‘ یہ ’’ہم عوام‘‘ والی تنظیم نہیں بلکہ ’’ہم لوگوں کی نمائندہ اقوام‘‘ والی تنظیم ہے۔

یہ یقین رکھیں کہ امریکہ خودمختاری کا کارڈ استعمال کرنے میں کافی جلد بازی دکھاتا رہا ہے‘ لیکن اپنے مفادات کے لیے اقوام متحدہ کے بعض دیگر ممالک بھی ایسا کرتے ہیں‘ نہ ہی (بقول امریکی وزیردفاع رمزفیلڈ) امریکہ کی ’’پرانے یورپ‘‘ کی تنقید بین الاقوامی تعاون سے مفر کرنے پر الزامات سے بری ہے‘ اس کی طرف سے اپنی معیشت کے لیے زرعی اور ثقافتی سبسڈیاں دینا منافقانہ فعل ہے‘ حالانکہ وہ عالمی سطح پر آزاد تجارت کا ڈھنڈورا بھی پیٹتا ہے اور تیسری دنیا پر دباؤ ڈالتا ہے کہ وہ تجارتی پابندیاں ختم کریں‘ اسی مؤقف سے 2003ء میں Cancum میں تجارتی مذاکرات تباہی کا شکار ہوئے تھے۔

شہریوں کو چاہیے کہ وہ سربراہان مملکت یا حکومتوں کا انتظار کرنے کی بجائے باہم انحصار کی ابتداء کریں اور عالمگیر تعاون کے لیے شہری ڈھانچہ تعمیر کریں‘ بلاشبہ وہ انتظار کے متحمل نہیں ہوسکتے‘ اس ضمن میں چیلنج یہ ہے کہ خودمختار سیاسی پالیسی کو عالمگیر حقیقتوں کے تناظر میں کس طرح اختیار کیا جاسکتا ہے‘ اس سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ گلوبل گورننس کا عمل اوپر سے نیچے نہیں بلکہ نیچے سے اوپر تک شروع کیا جانا چاہیے اور یہ کہ حکومتوں کی بجائے اس کے لیے کثیرالقومی شہری تعاون این جی اوز اور تجارتی تنظیموں کے اشتراک کار کی ضرورت ہوں‘ یہ جمہوریت کی مثالی تشکیل کے حوالے سے بھی اہم

ہے۔ آپ تعلیم کے لیے فاؤنڈیشن بنائیں' آزاد ادارے قائم کریں اور سیاسی دباؤ ڈالنے کی پوزیشن میں آ جائیں' دیگر الفاظ میں گلوبل گورننس کی سمت میں حکومتوں کی ہچکچاہٹ کا مطلب یہ نہیں کہ شہری بھی بین الاقوامی وسیع تر تعاون کے لیے کوئی اقدامات نہ کریں۔

مثال کے طور پر گلوبل گورننس کا دارو مدار گلوبل شہریت پر ہوگا' جو بدلے میں عالمگیر سول سوسائٹی اور تعلیمی شعبے کے فروغ میں کردار ادا کرے گا۔ شہری چاہے مقامی ہوں یا عالمی' وہ شہری پیدا نہیں ہوتے بلکہ بنتے ہیں۔ وہ تعلیم حاصل کر کے معاشرتی کردار کا تعین کرتے ہیں نہ کہ یہ کردار پیدائشی طور پر انہیں ملتا ہے۔ یہ وہ سبق ہے جو امریکہ کے بانیوں تھامس جیفرسن اور جان ایڈمز دونوں نے دیا ہے۔ ان دونوں کا اتفاق تھا کہ تعلیم یافتہ شہریوں کی عدم موجودگی میں تجرباتی نئے آئین کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ جیمز میڈیسن کے الفاظ میں ''حقوق کا بل اور آئین اس وقت تک کارآمد نہیں جب تک تعلیم یافتہ افراد موجود نہ ہوں' صرف پڑھے لکھے لوگ ہی اس دستاویز کو عملی شکل دے سکتے ہیں۔''

لہٰذا آج چیلنج یہ ہے کہ ہم اقوام متحدہ اور بریٹن ووڈز نظام نافذ کرنے سے قبل گلوبل گورننس کے لیے فاؤنڈیشن بنائیں' اس کے لیے انٹرنیٹ جیسے آلات جن سے القاعدہ اور نازیوں جیسی دائیں بازو کی تنظیمیں فائدہ اٹھا رہی ہیں کو استعمال کیا جائے' اس حوالے سے 2003ء میں Declaration of Interdependence نافذ العمل ہوا' جو عالمگیر شہری تعاون کی روح کا احاطہ کرتا ہے۔

عالمگیر انحصار کا اعلامیہ

ہم افراد عالم' انفرادی' قانونی اور ممتاز اقوام و کمیونٹیوں کے ارکان کی حیثیت سے باہم انحصار کا اعلان کرتے ہیں۔ ہم ایک مہذب دنیا کے شہری ہونے کا عزم کرتے ہیں' اپنی قومی اور علاقائی شناخت اور مفادات کے چکر میں پڑے بغیر ہم بنی نوع انسانیت کی مشترکہ فلاح کے لیے اپنی ذمہ داریاں قبول کریں گے۔

لہٰذا ہم براہ راست اقوام یا کمیونٹیوں کے توسط سے مل کر کام کرنے کا عہد کرتے ہیں تا کہ

- ☆ ایسا عالمگیر شہری' قانونی طرز حکمرانی تشکیل دیا جاسکے جس میں ہمارے مشترکہ حقوق کا تحفظ ہو سکے۔
- ☆ کرہ ارض کے ہر انسان کے حقوق کا تحفظ کرتے ہوئے انصاف اور مساوات کی ضمانت دی جاسکے اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ ہم میں سے کم تر لوگوں کو بھی طاقتور افراد کے برابر آزادیاں میسر ہوں۔
- ☆ سب کے لیے مفید ماحول تیار کیا جائے' جو کہ انسانی بقا کے لیے ضروری ہے۔ اس کے لیے دنیا کی دولت کی مساویانہ تقسیم ہونی چاہیے۔
- ☆ صحت' تعلیم اور دیگر سہولتوں کے حوالے سے ہم اپنے بچوں کے مشترکہ مستقبل کے لیے اقدامات کریں۔
- ☆ جمہوری پالیسیوں اور اداروں کو مضبوط کیا جائے۔
- ☆ ایسی آزاد جگہوں کو فروغ دیا جائے جہاں ہمارے مخصوص مذاہب اور ثقافتی شناختوں کو مساویانہ طور پر پنپنے کا موقع مل سکے۔

عالمگیر انحصار کا یہ اعلامیہ اور یوم عالمگیر انحصار نئے عالمگیر شہریوں کو اپنی صلاحیتوں کے اشتراک پر کاربند کرتا ہے امریکہ میں کوئی بچہ اس وقت تک اپنے بستر پر محفوظ سو نہیں سکتا جب تک بغداد' کراچی یا نیروبی میں بچے محفوظ نہیں ہوں گے۔ یورپی باشندوں کو اپنی آزادیوں پر غرور کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی' اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہر چیز کا ذمہ دار امریکہ ہی ہے یا یورپ بھی کبھی سامراجی طاقت تھا بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ باہم انحصار پر مبنی دنیا میں ناانصافی اور تکلیف کے اثرات سب کو سہنا پڑیں گے۔

گلوبل گورننس محض تخیلاتی خواب نہیں بلکہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی متبادل نہیں' تاہم اس کے وجود میں آنے سے قبل عالمگیر سول سوسائٹی اور شہریت کی تشکیل نہایت ضروری ہے' اس کے لیے نیچے سے اوپر تک گروپ اور شہری ایک چیلنج ہی رہیں گے۔

باب 27

امن کا حصول: تیسرے پہلو کی بیداری

ولیم ایل یوری

بحیثیت انسان ہمیں مل کر زندگی بسر کرنے سے زیادہ پیچیدہ چیلنج درپیش نہیں، ہم اپنے اختلاف کو دبانے یا ان کے باعث جنگ کرنے کے سوا ان اختلافات سے کیسے نمٹ سکتے ہیں؟

ہم اپنی کمیونٹی، ملک یا دنیا میں بقائے باہمی اور تنازعات کے حل کا شراکتی کلچر کیسے تشکیل دے سکتے ہیں؟

......چیلنج......

انسان کے وجود میں آنے کے بعد سے ہم پہلی بار ایک غیر معمولی دور میں رہ رہے ہیں، اس وقت 15 ہزار مختلف نسلی گروہ ایک دوسرے سے رابطے میں ہیں، آنے والی نسلیں اسے ''انسانی خاندان کے دوبارہ ملاپ کا دور'' بھی قرار دے سکتی ہیں۔

کسی خاندان کے دوبارہ ملاپ کا عمل اکثر اوقات مکمل طور پر پرامن نہیں ہوتا اور انسانی خاندان کے دوبارہ ملاپ کو بھی استثنیٰ حاصل نہیں، ایک دوسرے کے ساتھ ملنے کے دوران حرارت سے زیادہ شعلہ پیدا ہوسکتا ہے، مفاہمت سے زیادہ مزید تنازعہ جنم لے سکتا ہے۔ ''دوبارہ ملاپ'' کا مطلب مختصر طور پر جارحیت کی انتہا ہے کیونکہ لوگوں کو اپنے اختلافات پر متصادم ہونے کو مجبور کیا جاتا ہے، کیونکہ عدم مساوات پر غصہ اور حسد بڑھتا ہے اور کیونکہ مختلف تقاضوں اور عقائد سے شناختوں کو خطرات لاحق ہوتے ہیں، انسانی ارتقاء کی تاریخ میں پہلے کبھی انسانوں کو اربوں کی تعداد میں ایک ساتھ رہنے کی چیلنج کا سامنا نہیں رہا۔

مستقبل کا مؤرخ شاید یہ جان کر حیران نہیں ہوگا کہ پہلے دور میں بہت زیادہ تنازعات تھے بلکہ اسے اس بات پر حیرت ہوسکتی ہے کہ یہ تنازعہ زیادہ نہیں تھا' حتیٰ کہ اپنے تمام تنازعات اور جنگوں کے باوجود قوموں اور لسانی گروپوں کی ایک بڑی اکثریت ایک دوسرے کے ساتھ برقرار ہے۔ جنگ کوئی روایت نہیں بلکہ ایک استثنیٰ ہے' بقائے باہمی کوئی خیالی تصور نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے جو اکثر ادوار میں قوموں اور لسانی گروپوں کے درمیان تعلقات کار سے عبارت رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ جنگ اور تشدد کی اہمیت اس سے قطع نظر کم سمجھی جائے' یہ صرف ہمیں قیام امن کی طرف راغب ہونے کی یاددلاتی تھی۔

یوں انسانیت کو درپیش چیلنج یہ نہیں کہ وہ قطعی جنگ کو قطعی امن میں تبدیل کردے' اس کا مطلب صفر فیصد بقائے باہمی سے 100 فیصد بقائے باہمی نہیں بلکہ 90 فیصد سے 99 فیصد کی منزل حاصل کرنا ہے۔

تصادم کی منتقلی کی شدت

تصادم ایک فطری عمل ہے بلکہ دنیا میں بے انصافی سے نمٹنے کے لیے ضروری ہے' دنیا کو شاید کم نہیں زیادہ تصادم کی ضرورت ہوسکتی ہے' لہٰذا مقصد یہ نہیں ہونا چاہیے کہ تصادم کو ختم کردیا جائے بلکہ اسے پھیلایا جائے لیکن اس کی شکل تشدد زدہ جنگ سے مکالمہ' مذاکرات اور جمہوریت میں تبدیل کردی جائے۔

تصادم آگ کی طرح ہوتا ہے! قدرتی ' قابل قدر اور انتہائی خطرناک ! 20ویں صدی سے پہلے آگ شہر پناہ میں مقیم لوگوں کا بہت بڑا خوف تھی۔ بے قابو آگ چند لمحوں میں پورے شہر بلکہ قریبی شہروں کو بھی لپیٹ میں لے سکتی تھی' لیکن اس ثابت شدہ خطرے کے باوجود آگ کو طویل عرصے تک ایک فطری اور ناگزیر المیہ سمجھا گیا۔ انسانی قسمت کا حصہ قرار دیا گیا' اسی طرح جس طرح آج تشدد اور جنگ کو سمجھا جاتا ہے۔ بعض لحاظ سے آگ کے بارے میں نقطہ نظر تبدیل ہوا ہے' آج کے شہروں میں تعمیراتی قواعد اور فائر پروف میٹریل' ہنگامی اخراج کے راستوں اور سموک ڈیٹیکٹروں کی موجودگی میں لوگ تباہ کن آگ کے خوف سے آزاد ہوتے ہیں۔

بات جب تباہ کن تصادم سے بچاؤ کی ہوتی ہے تو انسانیت کے پاس آج وافر مواقع موجود ہیں' ہم اس تصادم کی ناگزیریت ترک کر کے قدم بقدم یہ سیکھ سکتے ہیں کہ اس سے کیسے بچا جاسکتا ہے یا اسے حل یا برقرار رکھا جاسکتا ہے۔مل کر کام کرتے ہوئے ہم تصادم کے پھیلاؤ کا جامع نظام تخلیق کر سکتے ہیں' جیسا کہ آگ کے ساتھ ہوتا ہے' یہ عمل بھی ناممکنات میں شامل نہیں۔

ایک مرتبہ مجھے اقوام متحدہ میں 20 ملکوں کے 40 ارکان پارلیمنٹ کے ایک گروپ میں جنگ سے بچاؤ کے موضوع پر مباحثے میں شرکت کا موقع ملا۔ چونکہ مثالی عالمی سکیورٹی اور حقیقت کے درمیان فرق خاصا وسیع تھا لہٰذا میں نے روایتی سیاسی تقریروں سے ہٹ کر کچھ کہنے کا سوچا' اس طرح میں نے تصوراتی خبرنامے سے بحث کا آغاز کیا۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ کے دوران ایک رپورٹر نے خبر دی کہ بھارت کے ایک شہر پر ایٹم بم گرا دیا گیا ہے' ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر دنیا بھر کے لوگوں نے فوری طور پر تباہی کے اثرات محسوس کیے اور انہوں نے نہ صرف جنگ کے خاتمے بلکہ ایٹمی ہتھیاروں کا استعمال ختم کرنے کا مطالبہ کیا' سیاسی دباؤ کی لہریں بھی کافی شدید تھیں۔ میں نے 40 ارکان پارلیمنٹ سے کہا کہ وہ اس منظر کا تصور کریں اور اقوام متحدہ کے ممالک سے تعلق رکھنے کی بناء پر بتائیں کہ وہ کیا کریں گے' اس پروگرام کے 2 گھنٹے بعد ایک پریس کانفرنس بھی ہونا تھی' اس طرح تمام نظریں اس پریس کانفرنس پر تھیں' ان کا ٹاسک یہ تھا کہ وہ سراسیمگی کا شکار دنیا کو یقین دہانی کرائیں۔

2 گھنٹے کے اندر 6 براعظموں سے 40 ارکان پارلیمنٹ نے بنیاد عالمگیر سکیورٹی کا ایک پلان تشکیل دیا اور حیران کن طور پر ایک متفقہ سمجھوتے پر پہنچ گئے۔ مجھے حیرت تھی کہ روایتی طور پر منقسم سیاستدان صرف آزادانہ تصور کی بناء پر کس طرح ایک نقطے پر متفق ہو گئے ہیں' مجھے ہر فرد کے سکیورٹی پر مؤقف کی شباہت پر بھی حیرت ہوئی...... یہ اتفاق رائے جرمنی سے کرائمیا اور میکسیکو سے امریکہ تھا' شاید مجھے اتنی حیرت نہیں ہونی چاہیے تھی' دنیا کے لئے سکیورٹی کا پلان بنانا کوئی انہونی بات نہیں۔ ہر پارلیمنٹیرین جانتا تھا کہ اس کا اپنے ملک کا سکیورٹی کے حوالے سے تجربہ کیا تھا: پولیس فورس تشدد روکنے کی صلاحیت رکھتی ہے' اس کے علاوہ وہ تباہ کن ہتھیاروں پر کنٹرول اور ان کے خاتمے کے بھی قابل ہے' جمہوری طور پر منتخب تنظیم اختلافات کو پرامن طریقے سے حل کر سکتی ہے۔ طاقتور عدالت

انصاف دے سکتی ہے اور ایک نیا ادارہ اور ثالثی کے سروس تنازعے کے آغاز سے پہلے ہی اس پر قابو پاسکتی ہے۔ لیکن دنیا ان ارکان پارلیمنٹ کی طرز پر نفاذ سے دور ہے تاہم اس حوالے سے سمت بالکل واضح ہے۔ انہوں نے جس، جس ادارے کی تجویز دی ان میں سے کوئی بھی اکیلے طور پر کارکردگی نہیں دکھا سکتا، ان اداروں کو مل کر کام کرنا ہوگا، اس کے ساتھ ساتھ اس کو مستحکم حفاظتی تدابیر او عالمی برادری کی حمایت بھی ضروری ہے۔

تیسرا پہلو

تصادم کے پھیلاؤ کی کسی کوشش کے قلب میں ایک تیسرا پہلو بھی ہوتا ہے، روایتی طور پر تصادم کے دورخ ہی سمجھے جاتے ہیں، یعنی ایک لسانی گروپ یا قوم کسی اور گروپ یا قوم کے مقابل ہوتی ہے، ہمیں یہ بھولنے کی ضرورت ہے کہ تنازعے کے دو رخ ہونے کے بارے میں ایک قدیم نظریہ پایا جاتا ہے اور یہ سوچنا ہوگا کہ ایک تیسرا پہلو بھی ہے، کوئی بھی تنازعہ کسی خلا میں جنم نہیں لیتا، دیگر لوگ بھی اردگرد ہوتے ہیں۔ رشتہ دار، ہمسائے، اتحادی، غیر جانبدار لوگ، دوست اور تماشائی، ہر تنازعہ ایک کمیونٹی کے اندر پیدا ہوتا ہے اور یہی کسی تصادم کا تیسرا پہلو تشکیل دیتا ہے۔

تیسرا پہلو اردگرد کی کمیونٹی ہوتی ہے، جو قضیے کے حامل Container کا کردار ادا کرتی ہے، اس حامل کی عدم موجودگی میں فریقین کے مابین سنگین تصادم تباہ کن اثرات مرتب کرسکتا ہے، تاہم اس کنٹینر کے اندر تصادم کو تنازعے سے بتدریج تعاون میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

تیسرا رخ محض تھیوری نہیں بلکہ یہ جنوبی افریقہ، شمالی آئرلینڈ، سری لنکا اور گوئٹے مالا میں تنازعات کی بتدریج تباہ کن کیفیت سے منتقلی کی عملی تفسیر نظر آتی ہے۔ گزشتہ 25 برس میں دنیا کے متنازعہ علاقوں میں بطور ثالث کردار ادا کرتے ہوئے میں نے امن کے قیام کی طرف پیش رفت ہوتے دیکھا ہے۔

تیسرا پہلو بیرون عناصر پر مشتمل ہوتا ہے، لیکن ان خارجی عناصر سے زیادہ اہم وہ لوگ اہم ہیں جن کے باہم روابط ہوتے ہیں اور جو تشدد کے مقابلے میں مکالمے اور مذاکرات کی بات کرتے ہیں، یہ بیرونی عناصر اندرونی عناصر سے تعاون کرتے ہیں، جنوبی افریقہ کے معاملے میں بیرونی دنیا نے نسل پرست حکومت کی ادارہ جاتی نسل پرستی کی مخالفت کی، کئی حکومتوں نے معاشی پابندیاں

لگائیں اور اقوامِ متحدہ نے افریقن نیشنل کانگریس کو سیاسی اور معاشی تعاون فراہم کیا۔ حکومتی تنظیموں نے ثالثی کے لیے ممتاز سٹیٹس مین وہاں بھیجے' چرچوں نے عوامی ضمیر کو متحرک کیا اور یونیورسٹی کے طلباء نے مظاہرے کیے' سخت دباؤ کے تحت کارپوریشنوں کو جنوبی افریقہ میں سرمایہ کاری سے روک دیا گیا۔ یہاں تک کہ اندرونی طور پر تیسرا پہلو کافی متحرک تھا۔ جب نیلسن منڈیلا اور ایف ڈبلیو ڈی کلارک اپنے اپنے فریق کی حمایت اور ان کے مفادات کے تحت کے لیے باہم دست وگریبان تھے تو انہوں نے تیسرے فرق کا محتاط کردار بھی ادا کیا اور تشدد سے پاک حل تلاش کرنے کی خواہش کی' ان کے ساتھ' ہزاروں دیگر اندرونی افراد بھی تھے جو مقصد کے حصول میں پرعزم تھے۔ چرچ اور بزنس مین طبقے نے سفید فام حکومت اور افریقن نیشنل کانگریس پر زور دیا کہ وہ مل کر قومی معاہدہ امن تشکیل دیں' ان کے علاوہ ملکی' علاقائی اور مقامی سطح پر تنازعات کے حل کی کمیٹیاں بنائی گئیں۔ یہ کمیٹیاں معاشرے کے ایسے مختلف طبقات کے افراد پر مشتمل تھیں جنہوں نے اس سے قبل ایک دوسرے سے بات کی تھی نہ مل کر کام کیا تھا' بہرحال یہ لوگ سیاہ اور سفید فام افراد میں کشیدگی رفع کرنے میں کافی معاون ثابت ہوئے۔ انہوں نے نچلی سطح تک جمہوریت کی تربیت کا بھی کام کیا۔ یوں تیسرے اندرونی فریق کی ایک بڑی تعداد اُبھر کر سامنے ائی' اس طرح ایک ایسا مضبوط محور بن گیا جو دونوں طرف انتہا پسندوں کا دباؤ زائل کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

جنوبی افریقہ میں ٹرانسفارمیشن کی اس حیران کن رفتار اور شدت کو محض ذہن کی تبدیلی سے واضح نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لیے دل و روح میں تبدیلی کی بھی ضرورت تھی۔ نیلسن منڈیلا کو سفید فام حکومت نے 27 برس تک قید رکھا اور ان کے ساتھ بُرا سلوک کیا لیکن رہائی کے بعد منڈیلا نے اپنے صیادوں اور سیاہ فام لوگوں پر جبر کرنے والوں کو معاف کر دیا' جب میں نے انہیں اپنے سفید فام دشمنوں کے بارے میں باتیں کرتے سنا تو میں نہایت متاثر ہوا کہ ان کی آواز اور لہجے میں کسی درماندگی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اور چونکہ ان کے دل کی یہ اندرونی تبدیلی ایک فرد کی طرف سے تنہا روح کی تلاش تھی لہٰذا یہ سلسلہ اسی جگہ نہیں رکا' ان کے نزدیک سیاہ فام اور سفید فام لوگ مل کر ملک کی تعمیر میں کردار ادا کر سکتے تھے اور خوشحالی کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ منڈیلا نے پہلے اپنے ساتھیوں اور پھر عام لوگوں کو مصالحت اور معاف کرنے کی روایت کی طرف گامزن کرنے میں کامیابی حاصل

کی' یوں ایک فرد کا اقدام کروڑوں افرد میں جذباتی تبدیلی کا باعث بن گیا' اس سیاسی مدت کے اثرات انتہائی دوررس نکلے۔

کیونکہ اندرونی اور بیرونی عناصر کے برعکس ''اندرونی تیسرے فریق'' کے بارے میں وضاحت کرنا مشکل ہوتا ہے'لیکن یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اس کی طاقت سے مفر ممکن نہیں' حتمی تجزیے میں گہری جڑوں کا حامل تنازعہ زیادہ تر فریقین کے جذباتی' نفسیاتی اور روحانی کام کے ذریعے حل ہوتا ہے' تیسرا فریق فرد واحد کے اندر ایک قسم کا ضمیر ہوتا ہے' یہ ایک ایسی آواز ہے جو پرانی تکالیف بھلانے پر زور دیتی ہے' سننے اور ہمدردی کا اظہار کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے' اس طرح تمام لوگوں کی انسانی ضروریات کا امر جرم جنم لیتا ہے۔ تیسرا پہلو یا فریق زندگی کو اہمیت دیتا ہے اور تشدد کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔

خارجی عناصر داخلی عناصر کو تقویت دیتے ہیں' اس طرح داخلی عناصر خارجہ عناصر کو متحرک کرتے ہیں اور یہ دونوں اندرونی تیسرے عنصر Inner Third Side سے متاثر ہوتے ہیں' مل کر کام کرتے ہوئے یہ جنوبی افریقہ جیسے علاقوں میں بھی تصادم کی شدت کم کرنے کا موجب ہو سکتے ہیں۔

مختصر یہ کہ تیسرا فریق کمیونٹی کے وہ افراد جو مخصوص قسم کی طاقت اور مخصوص پہلو استعمال کر کے مکالمے اور عدم تشدد کے مخصوص عمل کی حمایت کرتے ہیں اور جیت کا مخصوص نتیجہ حاصل کرنے کا مقصد رکھتے ہیں' ایک ایسا حل جو تمام فریقوں کی قانونی ضروریات کی تسلی کر سکے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک وسیع کمیونٹی کی ضروریات بھی پوری کر سکے۔

تیسرا فریق کمیونٹی کا ابھرا ہوا عزم ہے' یہ ایک ایسا عنصر ہے جو کمیونٹی کے ہر رکن کے باہمی متحرک تعلقات سے جنم لیتا ہے' لوگ تھرڈ سائیڈ میں کردار تو ادا کر سکتے ہیں لیکن کوئی اس پر کمانڈ نہیں کر سکتا' یہ ایک خود رو عمل ہے جس کے اپنے قدرتی قاعدے ہوتے ہیں۔

تیسرے فریق کی قابل سروس کیفیت جسم کا مزاحمتی نظام ہے' جب ایک جسمانی خلیے پر کوئی وائرس حملہ آور ہوتا ہے تو وہ مزاحمتی خلیوں کو ایک کیمیائی الارم بھیجتا ہے' یہ خلیے ٹی۔ سیل کو متحرک کرتے ہیں۔ نتیجتاً ٹی سیل خلیے کو حفاظت کے لیے آگے کرتے ہیں' اگر ٹی سیل کو پولیس امن فورس سے تشبیہ دی جائے تو مزاحمتی خلیے اردگرد کی کمیونٹی قرار دیئے جا سکتے ہیں جنہیں تباہ کن تصادم کو روکنے کے لیے

بیدار کرنا ضروری ہوتا ہے۔ یوں تیسرا فریق ایک طرح سے سماجی مزاحمتی نظام کا کردار ادا کرتا ہے جو تشدد کا وائرس پھیلنے کا عمل روکتا ہے۔

امن ممکن ہے، اگر............

اس سوال کہ کیا ہم سنگین تصادم کو تعمیری تصادم یا تعاون میں منتقل کر سکتے ہیں کا جواب ہے ''ہاں، اگر'' ہاں اگر دستیاب موقع سے فائدہ اٹھائیں، ہاں اگر تیسرا فریق بننے کی ذمہ داری قبل کر لیں، ہاں اگر ہم محنت کریں، ان تمام پہلوؤں میں ''اگر'' کا انحصار ہم پر ہے۔

یہ ''اگر'' کوئی چھوٹا موٹا ''اگر'' نہیں بلکہ یہ بڑا ''اگر'' ہے، اپنے تنازعات سے نمٹتے ہوئے انسانی اختلافات کا سامنا کرنا آسان نہیں، اپنی غلطی جاننے کے لیے خود کو آئینہ دکھانا جرأت مندی کا کام ہے، معاف کرنا دلیری کا متقاضی ہوتا ہے، سمجھوتے کی تلاش اور دوسرے فریق کو سننا صبر و تحمل کا تقاضا کرتا ہے۔

دوسرے لوگوں کے تنازعات میں مداخلت کرنا اتنا ہی مشکل کام ہے، کوئی بھی کسی واقعے کی ذمہ داری قبول کرنا پسند نہیں کرتا، کوئی بھی رشتہ داروں، دوستوں اور اتحادیوں سے تعلقات کشیدہ نہیں کرنا چاہتا، کشیدگی سے بھرپور صورتحال میں ٹانگ اڑانا خوفزدہ کرنے والا عمل ہے، تیسرا فریق بننا کوئی آسان ٹاسک نہیں۔

اگر ہم تیسرے فریق کے طور پر کامیاب ثابت ہوتے ہیں، میرا یقین ہے کہ ایسا ہوگا تو سکولوں کے بچے ایک دن حیران ہوں گے کہ سنگین تصادم آخر جنگ اور خوفناک تشدد کی شکل کیوں اختیار کرتے رہے، وہ یہ جان کر حیران ہو سکتے ہیں، ہم نے تصادم سے بچنے کی سادہ سی تدبیر کیوں نہیں کی، وہ یہ سوچ کر الجھن کا شکار ہو سکتے ہیں کہ لوگوں کو آخر اس کا خیال کیوں نہیں آیا، وہ حیران ہوں گے کہ ہم نے نہ ناگزیر چوائس اختیار کرنے میں اتنی تاخیر کیوں کی۔

جیسا کہ ایتھوپیا کی ایک ضرب المثل ہے کہ ''جب مکڑی کا جالا بُن جاتا ہے تو وہ شیر کو بھی پھانس سکتا ہے۔'' تیسرے فریق کا ہر قدم جو ہم امن کے لیے اٹھائیں گے وہ مکڑی کے جالے کی طرح متحد ہوگا، تنہا طور پر کچھ نہیں ہو سکتا، عالمی برادری کی امید مکڑی کا متحدہ جالا بُننے میں ہے، جو اتنا مضبوط ہو کہ تشدد اور جنگ کے شیر کو روکنے کے لیے کافی ہو۔

باب28

حسن سلوک کا رسک

مارٹن مارٹی

انسانی جارحیت کی جڑیں گہری اور کئی حوالوں سے پراسرار ہیں۔ارتقاء کے نظریے کے حامی بعض سائنسدانوں کی نظر میں انسان کا ارتقاء ایک پرتشدد خمیر سے اٹھایا گیا' بعض عمرانیات کے مکتبہ ہائے فکر کا خیال ہے کہ انسان علاقائی جارحیت کرتا ہے' اور فطری طور پر اپنی بقاء کے لیے زمین حاصل کرتا ہے یا اس کا تحفظ کرتا ہے۔ان کی سرگرمیاں اکثر و بیشتر ہلاکت خیز ہوتی ہیں' کیونکہ بعض دیگر جانور بھی یہی کام کرتے ہیں۔کئی دیومالائی روایتوں میں انسان دوسرے انسانوں سے لڑتے ہیں کیونکہ ان کا اس قدیم داستان پر یقین تھا جس کی بنیاد تشدد پر تھی' انسانی زندگی کے انہی پہلوؤں پر اکثر مذاہب کا اپنا فلسفہ ہے' یوں اکثر عیسائیوں کا کتاب پیدائش کی کہانی ''ہبوط آدم'' پر اپنا مؤقف ہے...... کچھ لوگوں کے لیے آدم وحوا کا گناہ ہے...... جو انہیں ان لوگوں کے مقابلے میں مطعون کرتا ہے جو بدی اور تشدد پر برابر یقین رکھتے ہیں۔

دوسری طرف انسانی تاریخ انسانی مہم جوئی کے ریکارڈ سے بھری ہوئی ہے' لوگ شاید یہ جانتے ہوں کہ وہ فطری طور پر تشدد پسند ہیں لیکن کئی اقسام کے فلسفوں میں انہیں امن پسندی کی قدر کی جھلک بھی ملتی ہے' قربانی اور شائستگی کے ذریعے وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر دوسروں کا خیال رکھتے ہیں۔بعض تہذیبوں میں انہوں نے ضابطے اور دستور تشکیل دیئے جو یہ بتاتے ہیں کہ انسانی مسائل کے حل کے لیے تشدد کے علاوہ بھی راستے ہیں اور مشترکہ بہتری کے اقدامات کیے جاسکتے ہیں۔کچھ دیومالاؤں اور مذہبی روایات میں بقول ابراہام لنکن ''ہماری فطرت کے اچھے فرشتے بھی ہیں۔'' مشاہدے اور نظریے دونوں طرح سے انہوں نے یہ کہا کہ انسانوں کی فطرت متلون مزاج ہے۔

مذہب: جواریوں کی اصطلاح میں...... انسانی فطرت' عمل اور کہانی دونوں طرف Stakes میں اضافہ کرتی ہے' مذہب ایک ایسا مسیحا ہے جو ہلاک کرتا ہے اور ایک ایسا قاتل ہے جو زخم بھرتا ہے۔ مختصر طور پر یہ کہ...... مذہب بذات خود ہلاک نہیں کرتا یا زندگی نہیں بچاتا...... اس پر یقین رکھنے والے لوگ اس مذہب کے دعوؤں پر ایمان لاتے ہیں' اس کے وعدوں کو قبول کرتے ہیں اور اس کے احکامات بجالاتے ہیں اور دراصل مذہب کے پیروکار ہی قاتل یا مسیحا ہوتے ہیں۔

بسا اوقات مذاہب کے نظریات اور اقدامات ایک دوسرے سے بھی متصادم ہوتے ہیں' ایک فوجی کمانڈر دشمن کو مارنے کا حکم دے سکتا ہے اور اپنے لوگوں کو بھی مرتے دیکھ سکتا ہے...... اسے ایسا لیڈر بھی سمجھا جاسکتا ہے جو بچوں سے نرمی اختیار کرتا ہے اور قیدی دشمنوں سے ملاقات کر کے ان سے ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

اگر مذہب سے یہ دونوں باتیں منسوب ہیں تو پھر انسانی اعمال کی انتہا پر اس کا وجود برقرار رہ سکتا ہے' کیا یہ لوگوں کو وحشیانہ انداز میں تباہ کن یا قابل تحسین طور پر تعمیری بنا سکتا ہے؟ مفکرین ہمیں بتاتے ہیں کہ مذہب کا آغاز ''اطاعت'' سے ہوا۔ خدا' طاقت' توانائی' رابطے یا نظریے کے سامنے اطاعت ......کسی بھی صورت میں کسی دوسرے کے ساتھ تصادم کو اضافی بوجھ تصور کیا گیا' مذہب پر عمل پیرا ہونے والے لوگ مزید طاقتور ہونے کے لیے دیگر لوگوں کی کمپنی کے طلبگار ہوتے یا کمپنی پسند کرتے ہیں۔ اس طرح انہیں مینڈیٹ اور مشن ملتے ہیں۔ ''لوگوں کو آزادی دو'' ...... ''ان قبیلوں کو ہلاک کر دو جو خدا پر یقین نہیں رکھتے......''۔

مختلف طبقات کے پیغامات اور عزائم آپس میں متصادم ہوتے ہیں...... نسلی' قبائلی' قومی یا مشترکہ مفادات کے پیش نظر...... موجودہ دور میں دنیا بھر میں لوگ غصے میں جمع ہوتے ہیں اور ان لوگوں کے خلاف اقدامات کی بات کرتے ہیں جو ان جیسا ہی کام کرتے ہیں' لیکن مختلف طبقوں کے لوگ مہلک تصادم کے نقصانات دیکھ سکتے ہیں' ایسا کرنا کبھی آسان نہیں رہا اور تصادم شروع ہونے کے بعد اس کی پیروی ناممکن ہوجاتی ہے' اس طرح حفاظتی اور چھوٹی سطح کے اقدامات شروع ہونے کا موقع پیدا ہوتا ہے۔

جن اقدامات کا جواز مذہب فراہم کرتا ہے انہیں ''ہماری فطرت کے اچھے فرشتے'' کیسے ظاہر

کر سکتے ہیں؟ یہ نظریہ کہ مذہب سے چھٹکارا حاصل کر کے تہذیبوں' ثقافتوں' معاشروں اور قوموں کے درمیان تصادم سے بچا جاسکتا ہے۔ تاریخ سے ہٹ کر سامنے نہیں رہا۔

گزشتہ صدی کے عظیم ''ازموں'' (Isms)......فاشزم' کمیونزم' نازی ازم اور ماؤ ازم...... کے رہنما کسی مذہب کی جگہ لینا یا اسے دبانا چاہتے تھے' تاہم کئی دہائیوں کے خون خرابے اور لاکھوں ہلاکتوں کے بعد وہ ناکام رہے۔ (حالانکہ خود انہوں نے بھی مذاہب کی بعض جزیات قبول کیں)' ان میں سے کسی نے اپنے آہنی کنٹرول کے سامنے کسی کو رعایت دینے کا کوئی موقع فراہم نہیں کیا۔

متضاد انتہا پر بعض لوگ ایک مذہب کے فروغ کے خواب کی بنیاد پر حل پیش کرتے ہیں' ان کے اس خیالی منظرنامے کو لوگ مسترد کرتے ہیں' انسانی تاریخ بہت مالا مال ہے' اس کے لوگ متنوع ہیں۔ مفادات مختلف ہیں' ان کے لیے کسی بات پر رضا کارانہ طور پر متفق ہونا زندگی کا ایک اہم ترین کام ہے۔ Inclusive مذاہب کی ایجاد کی کوششیں مدغم ہونے والے فریقوں میں توڑ پھوڑ کا باعث بنتی ہیں' پہلے جہاں دو لوگوں کو متحد ہونا تھا وہاں اب یہ تین تھے: متحد کرنے والے اور ان سے الگ ہونے والے دو دیگر گروپ۔

مذہب کے بغیر اور ایک مذہب دونوں قسم کی سوچیں منظرعام پر نہیں ہیں اور اگر اس کے لیے دباؤ ڈالا گیا تو لوگوں کی اکثریت اسے قبول نہیں کرے گی' اس طرح متبادل کے طور پر صرف ایک تیسری چوائس ہے کہ ان سب کو مکالمے کی طرح کرنا چاہیے۔

بات چیت کو دلائل سے مماثل نہیں قرار دیا جاسکتا' دلیل سوالات نہیں جوابات سے عبارت ہوتی ہے۔ اگر آپ کے پاس الوہیت' تقدیس' اسرار' خدا اور طاقت کا جواب ہے تو آپ مجھے قبول مذہب پر قائل کر سکتے ہیں' میری تضحیک کر سکتے ہیں یا مجھے ملک بدر کر سکتے ہیں' بات چیت کا عمل سوالات پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہم میں سے ہر کوئی بحیثیت فرد یا افراد' اپنے وعدے کر سکتا ہے اور دوسروں کا احترام کرنا سیکھ سکتا ہے۔

جہاں دو فریق (قوم' مذاہب' چرچ' مفادات' لسانی گروہوں وغیرہ) باہم مل سکتے ہیں وہاں وہ اپنے مشترکہ مفاد کے لیے راستے تلاش کر سکتے ہیں' وہ اپنے اختلافات کو مختلف انداز میں لیں گے' عمومی بات یہ ہے کہ گزشتہ صدی میں کئی قسم کے نظریات شروع ہوئے اور انہیں فروغ حاصل ہوا'

اکثر یہ کافی خوش کن نظر آتے ہیں یا نظرانداز شدہ بھی لگتے ہیں کیونکہ یہ مقامی اور اندرونی ہوتے ہیں۔ مختلف قوموں' نسلوں اور مذاہب کے لوگوں کا انسانی حقوق کے تحفظ پر اتفاق ہے' انسانی وقار اور تقدس کی ان کی نظروں میں اہمیت ہے۔

ایک مرتبہ یہ یقین ہوجائے کہ وہ مذاکرے کے عمل میں داخل ہوگئے ہیں اور ان کے حقوق اور وقار بھی محفوظ ہے تو وہ اپنے خیالات ظاہر کرنے میں آزاد ہوں گے' یہی وہ گہرائی ہے جو نظریات' اعتقادات اور عوامل کے مظاہرے کا باعث بنتی ہے۔

اس کے باوجود داستانیں' اعتقادات' روایات اور رسومات مختلف ہوتی ہیں تو پھر کیا کیا جائے؟

کئی لوگ کہتے ہیں' اول تو یہ کہ برداشت کا مادہ پیدا کیا جائے' مغرب کے ہر دور میں تحمل کی دریافت اور فروغ کو اہمیت حاصل رہی ہے اور اس کا مظاہرہ مشرق اور جنوب کی دنیا میں بھی ہوتا رہا' تاہم موجودہ حالات میں تحمل کا مظاہرہ سستا اور آسان ہے' اگر میں آپ کو قائل کر لیتا ہوں تو کئی مشکلات آسان ہوسکتی ہیں۔

ایک قدم اور اوپر' اور میں نے یہ گبریل مارسیل سے لیا ہے' وہ ہے عدم برداشت کا مقابلہ' یہ ان لوگوں کا اظہار ہے جو کسی بات پر گہرا یقین رکھتے ہیں اور کمیونٹی میں رہتے ہیں اور مختلف گروہوں میں رہنے والوں کے خیالات سے اختلاف رکھتے ہیں' اس طرح کسی اپروچ کی مختلف طریقے سے تشہیر ممکن ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کا مطلب تلاش کرنا کتنا مشکل کام ہے اور بالخصوص کسی کمپنی میں اس پر عملدرآمد کرنا زیادہ مشکل ہے۔ میں آپ کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ آپ کے مفادات محفوظ ہیں میں اپنی انڈرسٹینڈنگ استعمال کروں گا۔

اب مجھے ایک قدم اور آگے جانے دیجئے' جسے میں حسن سلوک کا رسک کہتا ہوں' اکثر مذاہب کی تعلیمات میں حسن سلوک کا درس اہم جزو ہے' خانہ بدوش معاشروں تک میں اجنبی سے کسی بنک والٹ کے بغیر بھی اچھے سلوک کا مظاہرہ کیا جاتا ہے' آج ہم اتنے سمجھ دار ہوچکے ہیں کہ محتاط طرز عمل اختیار کرسکیں لیکن محض سر کا استعمال کافی نہیں' آنکھیں کھول کر دیکھیں میزبانی اب بھی جاری ہے۔

آپ ہندو ہیں' مسلمان یہودی' میرے گھر آئیں اور میرے دسترخوان کا لطف اٹھائیں' لیکن مجھ سے یہ توقع نہ رکھیں کہ میں صلیب کا نشان ہٹا دوں گا' کیونکہ اس کے بغیر میرا گھر نامکمل ہوگا اور

میرے خیال میں روحانی طور پر مفلس ہوگا' اس کے باوجود میں مختلف انداز میں بات کروں گا اور زیادہ محتاط طور پر سیکھوں گا۔ آپ' ایک یہودی ہیں' مجھے جمعہ کی رات کو اپنے گھر مدعو کرتے ہیں تو میں آپ سے یہ توقع نہیں رکھوں گا کہ آپ یوم سبت (ہفتہ) کی رسومات ادا نہ کریں' میں نے آپ کی دعوت اس لیے قبول کی کہ آپ سے زندگی کے بارے میں کچھ سیکھ سکوں۔ آپ معمول سے ذرا ہٹ کر مجھے سنیں گے اور بولیں گے' اس طرح میں بھی کروں گا' یوں ہم دونوں کے تعلقات فروغ پائیں گے۔ یہ ٹھیک ہے کہ عالمی پیمانے پر کام کرنا بہت مشکل ہے۔

یہ عمل پیچیدہ اور نتیجہ بھی غیر یقینی ہے' آپ مہمان نوازی کا رسک لے رہے ہیں' یہ یا وہ نتیجہ اخذ نہیں کر رہے' تاہم گزشتہ صدی کے اچھے لمحات اور تحاریک کا جائزہ لیں تو موہن داس گاندھی' نیلسن منڈیلا' پوپ جان' مارٹن لوتھر کنگ جونیئر' ڈوروتھی ڈے اور ہزاروں دیگر ایسے افراد تحمل و رواداری کا مظاہرہ کر کے عدم برداشت کا مقابلہ کرتے اور مہمان نوازی کا رسک لیتے نظر کرتے ہیں۔ انہیں پتہ ہے کہ دہشت گردی اور جنگوں کے خطرے کا اس کے سوا کوئی متبادل نہیں' مذہبی لوگ شاید ''خدا کے سپاسی'' ہوں لیکن ان کی الوہی کتب کا حتمی درس امن ہے' جس کی تقلید انہیں کرنا ہوگی۔

پہلا پروف فائل چیک ہو چکی ہے عاصم
دوسرا پروف فائل چیک ہو چکی ہے عاصم Nov 4,2008
فائل فارمیٹ ہو چکی ہے عاصم